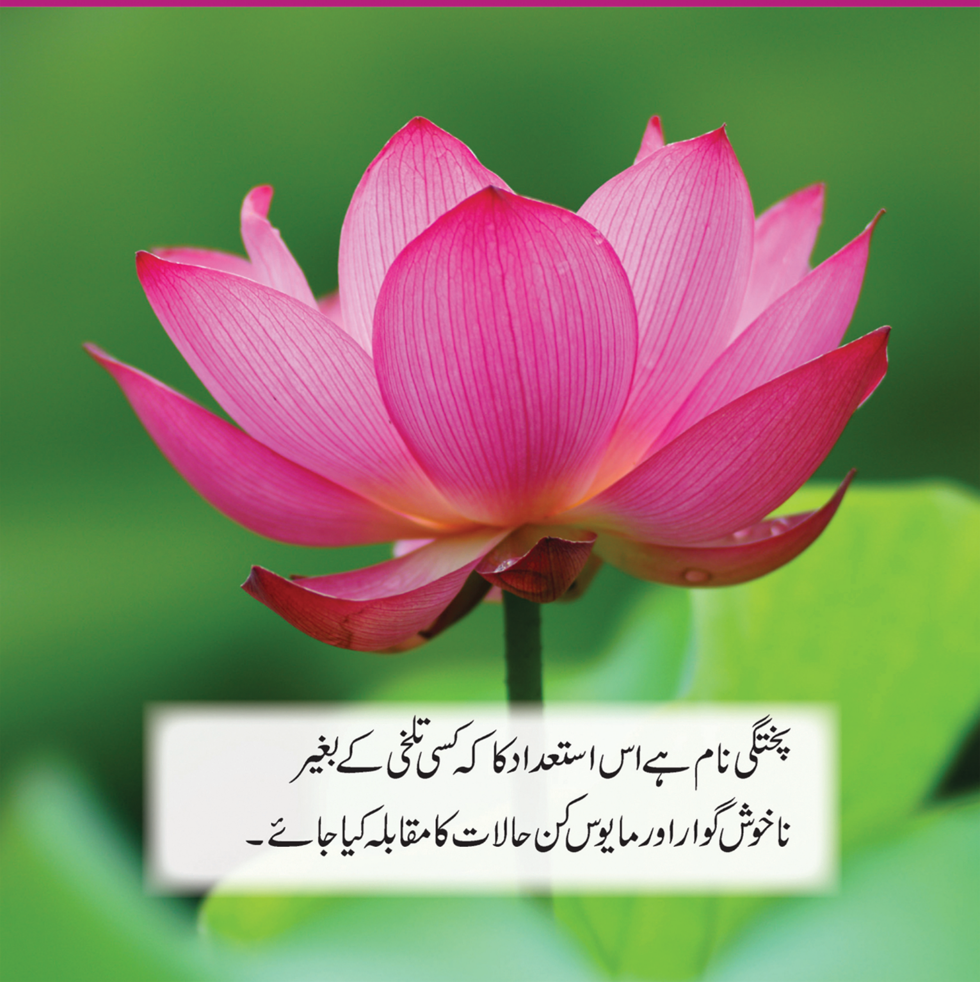
www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

January 1994 ● No. 206



پختگی نام ہے اس استعداد کا کہ کسی تلخی کے بغیر
ناخوش گوار اور مایوس کن حالات کا مقابلہ کیا جائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جنوری ۱۹۹۴، شمارہ ۲۰۶

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi -110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)

صبر کب تک

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ آپ الرسالہ میں اکثر صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ آخر یہ صبر کب تک۔ میں نے کہا کہ آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں خود آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ آپ پہلے میرے سوال کا جواب دیں۔ اس کے بعد میں اس بات کی وضاحت کروں گا جو آپ نے دریافت فرمائی ہے۔

پھر میں نے کہا کہ اسلام میں پانچ وقت کی نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر ایک شخص آپ سے پوچھے کہ آخر یہ پانچ وقت کی نماز کب تک پڑھی جاتی رہے گی، تو آپ ایسے شخص کو کیا جواب دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ نماز تو اللہ کی عبادت ہے۔ اس کی کوئی آخری حد نہیں۔ نماز ہر آدمی کو ساری عمر ادا کرنا ہے، یہاں تک کہ اس کی موت کا وقت آجائے۔

میں نے کہا کہ یہی آپ کے سوال کا جواب بھی ہے۔ صبر بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ آدمی کو اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک صبر کی روش اختیار کرنا ہے۔ موت سے پہلے کسی سے یہ حکم رفع نہیں ہوتا۔ ایک مسلمان کو جس طرح نماز پڑھنا ہے اسی طرح اس کو صبر بھی کرنا ہے۔

آپ دیکھئے۔ قرآن میں نماز کا حکم جن لفظوں میں دیا گیا ہے، ٹھیک انھیں لفظوں میں صبر کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ نماز کے بارہ میں قرآن میں ہے کہ: فصل لربك (الکوثر) اسی طرح صبر کے بارہ میں قرآن میں فرمایا کہ ولربك فاصبر (المدثر) اس سے معلوم ہوا کہ نماز بھی اللہ کے لیے ہے اور صبر بھی اللہ کے لیے۔ دونوں ہی مومن کی پوری زندگی کا کورس ہیں۔ دونوں ہی کی حد اس وقت آتی ہے جب کہ خود مومن کی زندگی کی حد آجائے۔

صبر با مقصد انسان کا اخلاق ہے۔ مومن سب سے بڑا با مقصد انسان ہوتا ہے۔ اس لیے مومن سب سے زیادہ صبر والا ہوتا ہے۔ ایمان آدمی کے دل کو نرم کرتا ہے۔ وہ آدمی کو دوسروں کا خیرخواہ بناتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر تواضع اور اعتراف کی صفت پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر یہ جذبہ ابھارتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے نفع بخش بنے۔ ان صفتوں کے ساتھ جو اخلاقی روش مناسبت رکھتی ہے وہ صبر ہی ہے۔ صبر کے بغیر کوئی شخص کبھی ان اعلیٰ صفات پر قائم نہیں رہ سکتا۔

کامیابی کا موقع

کامیابی کا موقع صرف ایک بار کسی شخص کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے ــــــ اس دنیا میں کامیابی کا موقع روزانہ آتا ہے۔ مگر وہ روزانہ چلا بھی جاتا ہے۔ اور جو موقع ایک بار چلا جائے وہ دوبارہ کسی کے لئے واپس نہیں آتا۔

کامیابی کا بہت گہرا تعلق مواقع سے ہے۔ جب کوئی بڑا موقع سامنے آتا ہے تو وہ بس تھوڑی دیر ٹھہرتا ہے۔ اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ موقع آنے کے وقت آدمی فوراً اس کو پہچانے۔ جو شخص کسی موقع کو شروع میں پہچان لے، وہ اس سے سب سے زیادہ فائدہ حاصل کرے گا۔ اور جو شخص اس کو پہچاننے میں دیر لگادے، وہ اس سے بڑا فائدہ حاصل کرنے میں ناکام رہے گا۔

جب ایک موقع آپ کے ہاتھ سے نکل جائے تو آپ اپنی اس محرومی کو اس طرح یافت میں بدل سکتے ہیں کہ پورے معاملہ پر بے لاگ انداز میں سوچیں۔ اس طرح آپ کے اندر یہ سمجھ پیدا ہوگی کہ دوسری بار جب ایک موقع آئے تو آپ فوراً اس کو پہچان لیں، اور پہلے ہی لمحہ میں اس کو استعمال کرکے آگے بڑھ جائیں۔

زندگی میں کچھ لمحات فیصلہ کے لمحات ہوتے ہیں، ان لمحات میں چوک جانا ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی بعد کو ممکن نہیں ہوتی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ان مخصوص لمحات کو پہچان نہیں پاتا۔ وہ غفلت میں ان لمحات کو ضائع کر دیتا ہے۔ بعد کو وہ جاگتا ہے، مگر اب اس کے لئے افسوس کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

ہر بار جب آپ کے دروازہ پر کھٹکھٹانے کی آواز آئے تو فوراً اس پر دھیان دیجئے۔ کیا معلوم کسی بڑی کامیابی کا موقع آپ کے دروازہ پر آپ کا انتظار کر رہا ہو۔ آنے والے موقع کا استعمال کیجئے، کیوں کہ جو موقع ایک بار آکر واپس چلا جائے وہ دوبارہ آپ کے پاس لوٹ کر آنے والا نہیں۔

اکثر لوگوں کی محرومی مواقع کو کھونے کا نام ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں، حالانکہ اصل حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ مواقع کو وقت پر استعمال نہ کرسکے۔

ہار کو ماننا

اپنی ہار کو ماننا اس عزم کا اظہار ہے کہ آدمی پھر سے محنت کرکے اپنی کھوئی ہوئی بازی کو دوبارہ جیتنا چاہتا ہے ـــــــ ہارنے کے بعد ہار کو مان لینا دوبارہ جیت کی طرف سفر کرنے کا پہلا قدم ہے۔

اگر آپ ہارنے کے بعد اپنی ہار کو نہ مانیں تو آپ ہار کے بعد جہاں کھڑے ہوئے تھے، آپ بدستور وہیں کھڑے رہیں گے۔ آپ نئے سفر کا آغاز کرنے کے قابل نہیں بنیں گے۔ مگر جب آپ ہارنے کے بعد اپنی ہار مان لیں تو آپ کا سفر فوراً دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔

ہار کو مان لینا اس بات کا اعتراف ہے کہ میں مقابلہ کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ اس کے برعکس ہار کو نہ ماننا گویا یہ کہنا ہے کہ میں مقابلہ کی دوڑ میں آگے ہوں۔ اب جو شخص واقعہ کے اعتبار سے پیچھے ہو وہ فرضی طور پر اپنے آپ کو آگے سمجھے تو وہ جھوٹے بھرم میں مبتلا رہے گا۔ اور جو لوگ جھوٹے بھرم میں مبتلا ہوں وہ اسباب کی اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

ہارنے کے بعد ہار کو مان لینا بہادری ہے۔ اور ہارنے کے بعد ہار کو نہ ماننا بزدلی۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو بہادر ثابت کرے۔ وہ اپنے آپ کو بزدلی کی سطح پر جانے نہ دے۔

اس دنیا میں کبھی ہار ہوتی ہے اور کبھی جیت۔ بلند انسان وہ ہے جو ہار جیت سے اوپر اٹھ کر سوچے، جو ہار جیت سے اثر لئے بغیر اپنی رائے قائم کرے۔ جو لوگ اس اعلیٰ صلاحیت کا ثبوت دیں، وہی اس دنیا میں اپنے مقصد تک پہنچتے ہیں۔ جو لوگ اس اعلیٰ صلاحیت کا ثبوت نہ دے سکیں وہ زندگی کے طوفان میں گھر کر رہ جاتے ہیں۔ وہ اپنی مطلوبہ منزل تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔

جو شخص ہار کو مان لے اس نے گویا ہار میں بھی جیت کا راز دریافت کر لیا۔ کیوں کہ وہ باہر کی دنیا میں وقتی طور پر ہار اگر وہ اپنے اندر کی ابدی دنیا میں بدستور فاتح رہا۔ اس نے اپنی عملی شکست کو اپنے ذہن کی شکست بننے نہیں دیا۔ جو آدمی ہار کو نہ مانے اس نے گویا اس معاملہ کو اپنے لئے وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ اور جو آدمی اس طرح کسی معاملہ کو وقار کا مسئلہ بنا لے وہ غلطی پر غلطی کرتا چلا جائے گا۔ وہ مسلسل ہارتا ہی چلا جائے گا، اس کے لئے دوبارہ جیتنے کا کوئی امکان نہیں۔

وقت کا استعمال

میں نے وقت کو برباد کیا تھا، اب وقت مجھے برباد کر رہا ہے ____ اگر آپ نے اپنے پچھلے دنوں میں وقت کو استعمال نہیں کیا ہے تو آپ اپنے اگلے دنوں میں اپنے وقت کو استعمال کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اس طرح آپ کی بربادی بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

وقت کسی آدمی کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ وقت اس لئے ہے کہ آدمی اس کو استعمال کرکے اپنے کو کامیابی کا اہل بنائے۔ جو آدمی وقت کو ضائع کرے اس نے صرف وقت کو ضائع نہیں کیا بلکہ خود اپنے آپ کو بھی ضائع کر دیا۔ کیوں کہ اس قسم کی غفلت کا نقصان اس کی اپنی ذات کے سوا کسی اور کو پہنچنے والا نہیں۔

جو وقت آپ کو ملا ہے اس کو یا تو اپنی تیاری میں استعمال کیجئے یا اپنے مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد میں۔ یہی وقت کا صحیح استعمال ہے۔ اگر ایسا ہے کہ آپ نہ تیاری میں لگے ہوئے ہیں اور نہ حصولِ مقصد کی جدوجہد میں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے وقت کو ضائع کر رہے ہیں۔

ملے ہوئے وقت کو ضائع کرنا بلاشبہ سب سے بڑا نقصان ہے۔ یہ ایسا نقصان ہے جس کی کوئی تلافی ممکن نہیں۔ آپ کھوئی ہوئی دولت کو دوبارہ کما سکتے ہیں۔ مگر آپ کھوئے ہوئے وقت کو دوبارہ لوٹا کر اپنی طرف واپس نہیں لاسکتے۔

وقت دولت ہے، بلکہ وقت ہی دولت ہے۔ وقت کے ذریعہ آپ دوسری چیزوں کو حاصل کرسکتے ہیں۔ مگر آپ دوسری چیزوں کے ذریعہ وقت کو خرید نہیں سکتے۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ وقت کے معاملہ میں سب سے زیادہ چوکنا رہیں۔

وقت بھاگ رہا ہے، وقت کو پکڑئے، کیوں کہ وقت آپ کو نہیں پکڑے گا۔ آپ کو خود وقت کو پکڑنا ہوگا۔

جو آدمی وقت کو کھودے، اس کے حصہ میں آخر کار صرف یہ آئے گا کہ وہ وقت کو گزرتا ہوا دیکھے مگر وہ اس کو استعمال نہ کرسکے۔

آغاز و انجام

اگر آپ نے اپنے آغاز کو پالیا تو آپ اپنے اختتام کو بھی پا سکتے ہیں۔ کیونکہ صحیح آغاز ہی کا دوسرا نام صحیح اختتام ہے ——— آدمی اگر صحیح رخ پر چل پڑے تو وہ منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔ منزل پر نہ پہنچنا ہمیشہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ آدمی نے اپنے سفر کا آغاز الٹی سمت میں کر دیا ہو۔

کائنات کا پورا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں جب بھی کوئی شخص ایک درست عمل کا آغاز کرے تو پوری کائنات اس کو تکمیل تک پہنچانے میں لگ جائے۔ باغبان ایک بیج زمین میں ڈالتا ہے تو دنیا کا پورا نظام اس کو پروان چڑھانے میں لگ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کے درجہ کو پہنچ کر پورا درخت بن کر کھڑا ہو جائے۔

اسی طرح اس دنیا میں جب کوئی آدمی ایک صحیح عمل کا آغاز کرتا ہے تو دنیا کا پورا نظام اس کی مدد پر آ جاتا ہے۔ ہر چیز اس کا ساتھ دینے لگتی ہے تاکہ وہ اپنے عمل کو اس کی تکمیل کے مرحلہ تک پہنچا سکے۔

اگر کوئی شخص دیکھے کہ اس کا شروع کیا ہوا عمل ترقی نہیں کر رہا ہے تو اس کو خود اپنی کارکردگی اور اپنے منصوبہ پر نظر ثانی کرنا چاہئے۔ یقینی طور پر اس کی اپنی طرف کوئی کوتاہی ہوگی۔ جس نے اس کے شروع کئے ہوئے عمل کو مطلوبہ انجام تک پہنچنے نہیں دیا۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ اقدام کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ لے۔ وہ حقیقت پسندانہ جائزہ کے بعد اپنا منصوبہ بنائے۔ اور جب اپنے منصوبہ پر عمل درآمد شروع کرے تو اپنے آپ کو اس میں لگانے میں کوئی کمی نہ کرے۔ آدمی نے اگر ان شرطوں کو پورا کر دیا تو اس کے بعد مستقبل میں جو چیز برآمد ہوگی وہ وہی ہوگی جس کی طلب وہ اپنے سینہ کے اندر لئے ہوئے ہے۔

ڈور کے ابتدائی سرے کو پانا ہی ڈور کے آخری سرے کو پالینا ہے۔ ڈور کے ابتدائی سرے کو مضبوطی سے تھام لیجئے۔ اس کے بعد ڈور کا آخری سرا بھی آپ کے ہاتھ میں آ کر رہے گا۔ وہ آپ سے جدا ہونے والا نہیں۔

صحیح اختتام کے سوا صحیح آغاز کی اور کوئی منزل نہیں۔

خاتمہ نہیں

مواقع نکل جاتے ہیں، مگر مواقع ختم نہیں ہوتے —— یہ موجودہ دنیا کا ایک ایسا سبق ہے جو گویا ہر ذرہ اور ہر پتی سے روزانہ نشر کیا جا رہا ہے۔

ہماری دنیا کو کسی انسان نے نہیں بنایا ہے بلکہ خدا نے بنایا ہے جس کی طاقتیں لامحدود ہیں۔ دنیا کو بنانے والا اگر انسان ہوتا تو اس کے امکانات محدود ہوتے۔ مگر جب لامحدود خدا نے اس کو بنایا ہے تو اس کے امکانات اور مواقع بھی لامحدود ہیں۔

کتنے ہی مواقع آپ کے ہاتھ سے نکل جائیں۔ کتنے ہی زیادہ امکانات کو آپ کھو دیں، پھر بھی آپ کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ ہمیشہ مزید امکانات اور مواقع آپ کے لئے موجود ہوں گے جن کو استعمال کر کے آپ اپنا مستقبل تعمیر کر سکیں۔

جب مواقع ختم ہونے والے نہ ہوں تو مواقع کے نکل جانے پر افسوس کرنا صرف بے خبر آدمی کا کام ہو سکتا ہے۔ جب ایک سواری چھوٹ کر دوسری سواری ملنے والی ہو تو مسافر اس سواری کا غم نہیں کرتا جو چلی گئی، بلکہ اگلی سواری کا انتظار کرتا ہے تاکہ اس میں بیٹھ کر اپنا سفر جاری کر سکے۔

موجودہ دنیا میں اصل اہمیت کی بات یہ نہیں ہے کہ ایک آیا ہوا موقع آپ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اصل اہمیت کی بات یہ ہے کہ دوسرے مواقع جو ابھی باقی ہیں، ان کو آپ نے پہچانا یا نہیں اور ان کو استعمال کر کے دوبارہ اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کا جذبہ آپ کے اندر جاگا یا نہیں۔ اگر یہ دوسری بات حاصل ہو جائے تو پہلی بات کی پروا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

زندگی نام ہے ایک موقع کو کھو کر دوسرے موقع کو استعمال کرنے کا۔ اسی طرح دوسرے کامیاب ہونے والوں نے کامیابی حاصل کی ہے۔ اور اسی طرح آپ بھی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ کامیابی کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہ دوسروں کے لئے ہے اور نہ آپ کے لئے۔

یہ قادر مطلق کی شان کے خلاف ہے کہ وہ ایسی دنیا بنائے جہاں مواقع اتنے کم ہوں کہ ایک موقع نکل جانے کے بعد دوسرا موقع آدمی کے لئے باقی نہ رہے۔

مسائل اور مواقع

مسائل کو مستقبل کے خانہ میں ڈالنا اور مواقع کو استعمال کرنا، یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا اصل راز ہے ——— اس دنیا میں ہمیشہ مسائل بھی ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ مواقع بھی۔ اس دنیا میں صرف وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو مسائل کو نظرانداز کریں اور مواقع کو استعمال کر کے آگے بڑھ جائیں۔

مسائل کا حل مسائل سے لڑنا نہیں ہے، بلکہ مواقع کو استعمال کرنا ہے۔ جب بھی آپ کو مسائل کا سامنا پیش آئے تو یہ دیکھئے کہ مسائل کے باوجود وہ کون سے امکانات ہیں جو اب بھی آپ کے لئے پوری طرح موجود ہیں اور جن میں آپ آزادانہ طور پر عمل کر سکتے ہیں۔

ان امکانات کو دریافت کر کے اپنی طاقتوں کو ان میں لگا دیجئے۔ اگر آپ ایسا کریں تو جلد ہی آپ دیکھیں گے کہ امکانات کو استعمال کرنے کے بعد مسائل اپنے آپ حل ہوتے جا رہے ہیں۔ جو کچھ حاصل ہو سکتا ہے، اس کو حاصل کر کے آپ اس کو بھی پا لیتے ہیں جو پہلے آپ کو ملا ہوا نہیں تھا۔

زندگی میں ساری اہمیت عمل کی ہے، اور عمل صرف ممکن دائرہ میں کیا جا سکتا ہے، ناممکن دائرہ میں عمل کرنا کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ جب آپ ممکن دائرہ میں اپنا عمل شروع کریں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی عملی قوتوں کو وہاں لگا رہے ہیں جہاں ان قوتوں کو نتیجہ خیز طور پر لگانا ممکن ہے۔ ایسی محنت کبھی نہ کبھی اپنا نتیجہ ظاہر کر کے رہتی ہے۔

اس کے برعکس جب آپ مسائل سے الجھیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی عملی قوت کو وہاں لگا رہے ہیں جہاں عمل کے باوجود کوئی نتیجہ پانا ممکن نہیں۔ ایسی محنت کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ بے فائدہ طور پر رائیگاں ہو کر رہ جائے۔

مسائل بذات خود کوئی چیز نہیں، اصل توجہ کی چیز مواقع ہیں۔ مواقع میں توجہ اور محنت صرف کر کے آپ مستقبل میں اپنے مسائل پر بھی قابو پا لیتے ہیں۔ لیکن اگر مسائل میں الجھے رہیں تو دونوں میں سے کوئی چیز بھی آپ کو ملنے والی نہیں۔

تاخیر نہ کہ ناکامی

شکست تاخیر ہے ، مگر شکست ناکامی نہیں —— شکست کسی کے لئے ایک درمیانی وقفہ ہے ، وہ اس کا آخری انجام نہیں۔ ایسی حالت میں شکست سے مایوس ہونے کی کیا ضرورت۔

زندگی کا سفر کبھی ہمواری کے ساتھ طے نہیں ہوتا۔ زندگی میں اتار چڑھاؤ آنا لازمی ہے۔ مختلف اسباب سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی نقصان اٹھاتا ہے یا ہار جاتا ہے۔ مگر زندگی میں ہر نقصان یا ہار کی حیثیت وقتی واقعہ کی ہے۔ آپ ایسے واقعہ سے بددل نہ ہوں۔ اور اپنی کوشش جاری رکھیں۔ آج نہیں تو کل آپ یقینی طور پر کامیاب ہو جائیں گے۔

نقصان صرف نقصان نہیں یا ہارنا صرف ہارنا نہیں۔ ان میں فائدہ کا پہلو بھی ہے۔ نقصان یا ہار کا واقعہ جب پیش آتا ہے تو اس سے آدمی کو بہت سے نئے تجربے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کی صلاحیتیں ازسرنو جاگ اٹھتی ہیں۔ اس طرح نئی چیز کو پانا، کھوئی ہوئی چیز کی تلافی بن جاتا ہے۔

ابتداءً میں جب کوئی شکست پیش آتی ہے تو فوری طور پر آدمی جھنجھلا اٹھتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے عمل کو جاری رکھے تو نئی کامیابیاں اس کو جلد ہی اتنی زیادہ خوشی اور اطمینان دے دیں گی کہ پچھلی بات اس کو یاد بھی نہیں رہے گی۔ فتح کی خوشی شکست کے سارے غم کو بہت جلد بھلا دے گی۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ آگے کی طرف دیکھے۔ وہ آج کے بجائے کل پر اپنی نظریں جمائے رہے۔ جو شخص ایسا کرے گا، اس کے لئے وقتی ناخوش گواریوں کو جھیلنا آسان ہو جائے گا۔ آنے والی جیت کی خاطر وہ آج کی ہار کو بھول جائے گا۔ شام اس کے لئے شام نہ ہوگی، بلکہ سادہ طور پر وہ صبح کا انتظار بن جائے گی۔

وقتی شکست کا پیش آنا لازمی طور پر آپ کی کوتاہی نہیں ، وہ فطرت کے عمومی قانون کی بنا پر ہے۔ یہ دنیا اسی ڈھنگ پر بنائی گئی ہے کہ یہاں فتح کے ساتھ شکست بھی پیش آئے، یہاں کامیابی کے ساتھ آدمی کو ناکامی کا بھی تجربہ ہو۔ گویا کہ جو ہوا ، وہی ہونا بھی چاہئے تھا ، ایسی حالت میں دل شکستہ ہونے کی کیا ضرورت۔

نادانی اور دانش مندی

نادان نے کہا کہ میں نے اپنے ماضی اور حال کو برباد کر دیا۔ دانش مند بولا، مگر مستقبل تو برباد نہیں ہوا —— آدمی کی زندگی صرف ماضی اور حال کے اوپر ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کی لمبی زندگی میں مستقبل بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ پھر کوئی شخص ماضی اور حال کے کھونے کا غم کیوں کرے، جب کہ مستقبل اب بھی آپ کے پاس پوری طرح موجود ہے۔

کوئی شخص اپنے گزرے ہوئے دنوں کو گنوا سکتا ہے۔ مگر اس کے آنے والے دن تو اب بھی اس کے پاس باقی ہیں۔ اگر آدمی اپنے احساس کی شدت کو پچھلے دنوں کی تلخ یاد میں نہ لگائے بلکہ اس شدت کو آنے والے دنوں کو استعمال کرنے میں لگا دے تو ہو سکتا ہے کہ پہلے اس نے جو کچھ کھویا ہے، اس کو وہ آئندہ مزید اضافہ کے ساتھ حاصل کر لے۔

ماضی آپ کے ہاتھ سے نکل چکا، حال بھی آپ کا ساتھ چھوڑ رہا ہے۔ اب جو چیز آپ کے پاس باقی ہے وہ صرف آپ کا مستقبل ہے۔ آپ بیتے ہوئے دن یا جانے والے لمحات کا غم کیوں کریں۔ آنے والے دن جو اب بھی پوری طرح آپ کے قبضہ میں ہیں، ان پر اپنی ساری توجہ لگا دیجئے۔ یہی ممکن بھی ہے اور یہی عقل کا تقاضا بھی۔

نادان کی نظر ہمیشہ پیچھے کی طرف ہوتی ہے اور دانش مند کی نظر ہمیشہ آگے کی طرف۔ نادان آدمی صرف اس کو جانتا ہے جو ہو چکا۔ دانش مند اس کو بھی جانتا ہے جو ہو سکتا ہے۔ آپ نادان نہ بنئے، آپ کوشش کیجئے کہ آپ کا نام دانش مندوں کی فہرست میں لکھا جائے۔

جب آدمی کے لئے دانش مند بننے کا موقع بھی موجود ہو اور اسی کے ساتھ نادان بننے کا موقع بھی، تو وہ نادان کیوں بنے، کیوں نہ وہ دانش مند بننے کی کوشش کرے۔ وہ تاریکیوں میں کیوں بھٹکے، جب کہ روشنی کے دروازے بھی اس کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔

زندگی ایک مسلسل سفر ہے جو ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی طرف جاری ہے۔ جو شخص ماضی اور حال میں اٹک کر رہ جائے وہ گویا زندگی کی حقیقت کا انکار کر رہا ہے۔ اور حقیقت کا انکار کرنے والا خود اپنا انکار کرتا ہے، حقیقت کو بدلنا اس کے لئے کسی طرح ممکن نہیں۔

گر کر اٹھنا

نہ گرنا کمال نہیں۔ کمال یہ ہے کہ تم گرو، اور پھر از سرِ نو اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ ـــــ جو شخص نہیں گرا، اس نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ کارنامہ انجام دینے والا وہ ہے جو گرے اور پھر اٹھ کر چلنے لگے۔

جو آدمی نہیں گرا وہ حقیقۃً چلا ہی نہ تھا۔ کیوں کہ اس دنیا میں ہر چلنے والا گرتا ہے۔ پھر ایسے نہ گرنے کی کیا قیمت۔ انسان کی شان اسی میں ہے کہ وہ چلے۔ انسان چلنے کے لئے بنایا گیا ہے، وہ بیٹھنے کے لئے نہیں بنایا گیا۔ اور جب وہ چلے گا تو ضرور ہے کہ اس کے ساتھ گرنے کا واقعہ بھی پیش آئے۔

نہ گرنا ٹھہراؤ کی علامت ہے اور گرنا حرکت اور عمل کی علامت۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے گرنے پر شرمندہ نہ ہو بلکہ اِس کو اپنی اعلیٰ انسانیت کا ثبوت سمجھے کہ اُس کے ساتھ گرنے کا واقعہ پیش آیا۔ جب وہ اس طرح سوچے گا تو وہ گرنے کے بعد فوراً اٹھ کر دوبارہ کھڑا ہو جائے گا۔

نہ گرنا کمال نہیں، کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ نہ چلنا کمال نہیں۔ از سرِ نو اٹھنا کمال ہے، کا مطلب یہ ہے کہ چلتے رہنا کمال ہے۔ کیوں کہ جو شخص ٹھہرا رہے، وہی گرنے سے بچے گا۔ چلنے والوں کا معاملہ اس دنیا میں یہی ہے کہ وہ بار بار گرتے ہیں اور پھر بار بار اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آدمی جب گرتا ہے اور پھر دوبارہ اٹھ کر چلنے لگتا ہے تو وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ گرنا اس کے لئے نئے حوصلہ کا ذریعہ بن گیا۔ گر کر اس نے دوبارہ اپنے لئے ایک نئی طاقت حاصل کر لی۔

بیٹھنے کے بجائے چلئے، اور چلنے کے بعد جب گریں تو اٹھ کر کھڑے ہو جائیے۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا راز ہے۔ آپ اپنے لئے نئی دنیا نہیں بنا سکتے۔ اس لئے آپ گرنے سے بھی اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے۔ کیوں کہ دنیا کو بنانے والے نے اس دنیا کو اسی طرح بنایا ہے۔

الرسالہ جنوری ۱۹۹۳

انتقام نہیں

انتقام لینے سے پہلے سوچ لو کہ انتقام کا بھی انتقام لیا جائے گا —— یہ زندگی کی ایک اہم حقیقت ہے، اور جو شخص موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی گزارنا چاہتا ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اس حقیقت کا پورا لحاظ کرے۔

ایک شخص سے آپ کو تکلیف پہنچی۔ آپ کے دل میں اس کے خلاف انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ آپ چاہنے لگے کہ اس سے بدلہ لے کر اپنے سینہ کی آگ ٹھنڈی کریں۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک شخص کے تکلیف دینے سے آپ کے اندر انتقام کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ پھر وہی تکلیف جب آپ دوسرے آدمی کو دیں گے تو کیا اس کے اندر دوبارہ وہی انتقامی جذبہ نہیں پیدا ہو جائے گا۔

یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ آپ کے انتقام کے بعد وہ بھی انتقام لے گا۔ اس طرح برائی کا ایک چکر چل پڑے گا۔ آپ کو ایک تکلیف کے بعد دوسری تکلیف سہنی پڑے گی۔ اس لئے عقلمندی یہ ہے کہ نظر انداز کرنے کا طریقہ اپنا کر بات کو پہلے ہی مرحلہ میں ختم کر دیا جائے۔

جب آپ کسی سے انتقام لیں تو یہ کوئی سادہ بات نہیں ہوتی۔ انتقام لینے کے لئے آپ کو اپنی طاقت خرچ کرنی پڑتی ہے۔ وقت اور پیسہ کی کافی مقدار خرچ کئے بغیر کوئی شخص کسی دوسرے آدمی سے انتقام نہیں لے سکتا۔

اب اگر انتقام لینے والا اپنے انتقام کے منصوبہ میں کامیاب ہو جائے تب بھی یہ اپنا کچھ اور اثاثہ کھونے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ انتقام لے کر آدمی آخر میں جو چیز پاتا ہے، وہ صرف ایک نفسیاتی تسکین ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

لیکن اسی وقت اور اسی رقم کو اگر کسی مثبت کام (مثلاً کاروبار) میں لگایا جائے تو وہ شکل بدل کر محفوظ رہتا ہے، یہاں تک کہ مزید نفع کے ساتھ آدمی کی طرف لوٹتا ہے۔ انتقام لینے میں طاقت لگانا طاقت کو کھونا ہے۔ مثبت کام میں طاقت لگانا طاقت کو اضافہ کے ساتھ دوبارہ پا لینا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کو اپنا اثاثہ پانے کی مد میں خرچ کرنا چاہئے نہ کہ کھونے کی مد میں۔

اسلام میں عدل اجتماعی

رانچی (بہار) کے لاکالج میں ۱۴ دسمبر ۱۹۹۱ کو مسٹر جسٹس ستیشور رائے کی زیر صدارت تعلیم یافتہ افراد کا ایک اجتماع ہوا۔ اس میں میں نے خطاب کیا۔ خطاب کا موضوع تھا: اجتماعی عدل اسلام میں (Social justice in Islam) ذیل میں اس کو کسی قدر اضافہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

سوشل جسٹس کا مطلب سادہ طور پر سب کے لیے انصاف (justice to all) ہے۔ اسلام سے پہلے انسانی سماج میں اس قسم کا مساویانہ انصاف نظری اور عملی دونوں اعتبار سے تقریباً معدوم تھا۔ اسلام نے تاریخ میں پہلی بار مساویانہ انصاف کو قائم کیا۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس کا اعتراف خود غیر مسلم مفکرین نے کیا ہے۔ مثال کے طور پر سوامی ویویکانند (۱۹۰۲-۱۸۶۲) نے اپنے خطوط (Letters) میں کہا ہے کہ اگر کبھی کوئی مذہب انسانی برابری تک قابل لحاظ درجہ میں پہنچا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے:

> If ever any religion approached to this equality in any appreciable manner, it is Islam and Islam alone. (p.379)

اس معاملہ میں اسلام کا جو حصہ (contribution) ہے، وہ ایک نہایت تفصیلی کتاب کا طالب ہے۔ تاہم اصولی طور پر اس کو تین باب میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ انسانی برابری اور مساوی انصاف کے حق میں ایک مکمل نظریہ (ideology) پیش کرنا۔ اس قسم کا ایک نظریہ انتہائی ضروری ہے۔ نیز اس نظریہ کو لازمی طور پر حقیقی بھی ہونا چاہیے۔ اسلام نے اس سلسلہ میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس میں یہ دونوں صفتیں پوری طرح پائی جاتی ہیں۔

۲۔ اس نظریہ کو اپنی زندگی میں اختیار کرنے کے لیے ایک طاقتور محرک (incentive) دینا۔ یہ محرک اتنا گہرا ہونا چاہیے کہ وہ مساوات برتنے اور سماجی انصاف کرنے کو ہر آدمی کا ذاتی مسئلہ بنا دے۔ اس کے بعد ہر آدمی خود اپنی فلاح کے لیے اس کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے۔

۳۔ ہر شعبۂ حیات میں برابری اور مساوی انصاف کا ایک حقیقی نمونہ (example) قائم کرنا۔ اگر ایسا نمونہ واقعہ میں موجود نہ ہو تو لوگ برابری کے سلوک کی بات کو صرف ایک خیالی چیز سمجھیں گے،

وہ اس کو قابل عمل سمجھنے پر کبھی آمادہ نہ ہوں گے۔

مساوی انصاف کا نظریہ

قدیم ترین زمانہ سے اونچ نیچ کے نظریات ہر جگہ پائے جاتے رہے ہیں۔ اور اس بنا پر ہر دور میں سماجی ناانصافی کا عمل بھی جاری رہا ہے۔ قدیم زمانہ کا کوئی بھی دور اس سے خالی نظر نہیں آتا۔ یہ ایسا کلیہ ہے جس میں معلوم تاریخ کے مطابق، کوئی استثنا نہیں۔

قدیم یونان مفکرین اور مصلحین کی پیدائش کے لیے مشہور ہے۔ مگر قدیم یونان کے مشہور فلسفی ارسطو کا خیال تھا کہ کچھ لوگ پیدائشی طور پر غلام (natural slaves) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ بعض مفکرین نے اس سے اختلاف کیا۔ تاہم ان کا اختلاف بے اثر ثابت ہوا۔ اور غلامی عملی طور پر یونان اور روم میں وسیع پیمانہ پر مسلسل جاری رہی:

Aristotle regarded some humans as natural slaves a point on which later Roman philosophers especially the stoics and jurists, disagreed with him. Although slavery was as widespread in Rome as in Greece. (5/93)

یہی حال قدیم زمانہ میں ساری دنیا کا رہا ہے۔ انڈیا میں ہزاروں برس سے یہ نظام قائم تھا کہ کچھ لوگ اونچی ذات والے ہیں اور کچھ لوگ نیچی ذات والے۔ اونچی ذات والوں کو حق تھا کہ وہ نیچی ذات والوں کے ساتھ ہر قسم کا غیر مساوی سلوک کریں۔ بھارتی فکر میں یہ غیر مساوی تصور اتنا راسخ ہے کہ موجودہ زمانہ میں نئے قوانین بنائے جانے کے باوجود یہ تفریق نہ عملی طور پر ختم ہو سکی اور نہ فکری طور پر۔

یورپ کے لوگوں نے دیکھا کہ وہ سفید فام ہیں اور افریقہ کے لوگ سیاہ فام۔ انھوں نے یہ فرض کر لیا کہ سفید لوگ پیدائشی طور پر اونچے لوگ ہیں اور سیاہ فام لوگ پیدائشی طور پر نیچے لوگ۔ سفید فام کو جائز طور پر یہ حق ہے کہ وہ سیاہ فام کو غلام بنائے اور ان سے اپنی خدمت لے۔

افریقہ کو سیاہ براعظم (dark continent) قرار دیا گیا۔ جغرافی ذرائع اور انسانی صلاحیت کے اعتبار سے افریقہ یکساں طور پر ایک قیمتی زمینی خطہ تھا۔ مگر یہاں کے لوگوں کی جلد کا رنگ چونکہ سیاہ تھا، وہ پیدائشی طور پر کمتر مان لیے گئے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں یورپ میں یہ ذہن پیدا ہوا کہ

نیگرو پیدائشی غلام ہیں۔ یہ ابتدائی دور کے لوگ ہیں اور تہذیب کو اختیار کرنے کے لیے نااہل ہیں :

The negro is a natural slave. The Europeans regarded the African as primitive without culture and incapable of civilisation. Slave Trade in Africa, 1985, p.7

نسلی بادشاہت کے نظام میں شاہی خاندان والوں نے اپنے آپ کو آقا سمجھ لیا اور دوسروں کو رعایا۔ ان کا خیال یہ ہوگیا کہ انھیں دوسروں کے اوپر پیدائشی فضیلت حاصل ہے۔ اور ان کو مطلق طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسروں کے اوپر حکومت کریں اور دوسروں پر لازم ہے کہ وہ ان کے آگے جھک جائیں۔ تمام قدیم زمانوں میں بادشاہ یا تو خدا سمجھے جاتے تھے یا خدا کے نمائندہ (God's representative) عوام کی یہ لازمی ذمہ داری تھی کہ وہ ہر حال میں بادشاہ کے مطیع اور فرماں بردار بنے رہیں (V/816)

اسی طرح دولت مند لوگوں نے اپنے آپ کو حقوق یافتہ طبقہ (privileged class) سمجھ لیا اور غریب لوگوں کو محروم طبقہ (deprived class) قرار دیا۔ جس آدمی کے پاس دولت آجائے وہ گویا ایک علامت تھی کہ وہ خدا کی عنایت و رحمت سے فیض یاب ہوا ہے۔ اور جس آدمی کو دولت نہ ملے وہ گویا ایک ایسا شخص ہے جس کو خدا نے اپنی عنایتوں سے دور کر دیا۔

سماجی ناانصافی کے یہ تمام نظریات اس لیے پیدا ہوئے کہ لوگوں نے انسان اور انسان کے درمیان فرق دیکھا۔ یہ بجائے خود ایک حقیقت ہے کہ ایک انسان اور دوسرے انسان، ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان ظاہری اعتبار سے مختلف قسم کے فرق پائے جاتے ہیں۔ مثلاً رنگ کا فرق، جسمانی بناوٹ کا فرق، دولت اور طاقت کا فرق، وغیرہ۔ اسی فرق کی غلط توجیہہ نے مذکورہ تمام امتیازات اور بے انصافیوں کو پیدا کیا ہے۔

سماجی نابرابری کا تصور تاریخ میں مسلسل پایا گیا ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان فروق (differences) کو پیدائشی (inborn) سمجھ لیا گیا۔ مختلف قسم کے نظریے اور فلسفے وجود میں آئے جو انسانوں کے درمیان فرق کا کوئی نہ کوئی ایسا سبب بتاتے تھے جس کا تعلق پیدائش سے ہوتا تھا۔ فرق کی یہی مبنی بر پیدائش توجیہات (birth-based explanations) وہ نظریاتی سبب ہیں جنھوں نے "پائے ہوئے" لوگوں کو یہ جواز دیا کہ وہ "کھوئے ہوئے" لوگوں کو برابری کا درجہ اور

برابری کا انصاف دینے سے انکار کرسکیں۔

مثلاً ہندستان میں اس فرق کو دیکھ کر ورن کا عقیدہ پیدا ہوا۔ ورن کے لفظی معنی رنگ کے ہوتے ہیں۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے رنگ میں فرق ہے، اس سے انھوں نے یہ اخذ کیا کہ ایک قسم کے رنگ والے خدا کے سر سے پیدا ہوئے ہیں اور دوسرے قسم کے رنگ والے خدا کے پاؤں سے :

Indian society is made up of four different varnas. The Rigveda (10.90) has declared that the Brạhmin, the Ksatriya, the Vaisya, and the Sudra issued forth at creation from the mouth, arms, thighs and feet of Purusa. (X/361)

یورپ میں نسلی امتیاز کا نظریہ (racism) پچھلی صدیوں میں شدت کے ساتھ پھیلا۔ اور اب تک وہ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ ابتداءً یہ ذہن اس لیے پیدا ہوا کہ اہل یورپ نے اپنے اور دوسروں کے درمیان رنگ اور کلچر میں فرق پایا۔ اس سے انھوں نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ وہ دوسروں سے برتر (superior) ہیں اور دوسرے لوگ ان سے کمتر (inferior)

موجودہ زمانہ میں نظریۂ ارتقاء کے ظہور نے اس کو مزید پختہ کر دیا۔ کیوں کہ سماجی ڈارونیت (Social Darwinism) کے تحت یہ سمجھ لیا گیا کہ انسانیت مختلف ارتقائی مرحلوں سے گزری ہے اور مغربی تہذیب اس کا درجۂ کمال ہے :

Mankind was regarded as having achieved various levels of evolution, culminating in the white-European civilization. (15/363)

اس کے مطابق، یورپ کے سفید فام لوگ ارتقاء یافتہ نسل قرار پائے اور دوسرے غیر سفید فام طبقے عملِ ارتقاء میں پیچھے رہ جانے والے لوگ۔

قدیم زمانہ میں نسلی فرق کے بارہ میں توہماتی نظریات کی بنا پر امتیاز کا ماحول پیدا ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ میں ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء نے بظاہر اس امتیاز کے حق میں ایک علمی بنیاد فراہم کر دی۔ کیوں کہ اس نے بتایا کہ بہت سے انسانی گروہ ارتقائی عمل میں دوسروں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ کچھ گروہ عملِ ارتقاء میں اعلیٰ (superior) ہو گئے اور کچھ دوسرے گروہ پچھڑ کر ارتقاء کے ابتدائی مرحلہ

(primitive stage) میں پڑے رہے۔

اس ارتقائی نظریہ کی بنا پر یورپی قوموں نے دوسری قوموں کو اپنے سے کمتر سمجھ لیا۔ اس کے نتیجہ میں سفید فام کی ذمہ داری (whiteman's burden) کا نظریہ پیدا ہوا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سفید فام اقوام کو یہ حق ہے کہ وہ دنیا پر قبضہ کریں اور ان کے اوپر تہذیب کی معلم بنیں۔ موجودہ دور کے نوآبادیاتی نظام (colonialism) کے پیچھے یہی ارتقائی منطق کام کرتی رہی ہے۔

یہ تصورات کسی نہ کسی طور پر آج تک قائم ہیں۔ آج کی دنیا کو وسیع تقسیم میں دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ روایتی دنیا اور سائنٹفک دنیا۔ بظاہر ایک غیر ترقی یافتہ ہے اور دوسری ترقی یافتہ۔ مگر سماجی بے انصافی کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ دونوں ہی ایسے عقائد پر مبنی ہیں جو سماجی انصاف کے راستہ میں مستقل رکاوٹ ہیں۔

روایتی دنیا بڑی حد تک "کرم" کا عقیدہ ماننے والوں کی ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر آدمی جو پیدا ہوا ہے وہ پچھلے کرموں کا بوجھ لیے ہوئے ہے۔ یہ نیچر کا قانون ہے اور آدمی کو بہر حال اسے بھگتنا ہے۔ اس عقیدہ کی روشنی میں سماجی انصاف کا محرک بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس عقیدہ کے مطابق، جس چیز کو ہم "ناانصافی" کہتے ہیں وہ ناانصافی نہیں رہتی بلکہ وہ آدمی کے اوپر نیچر کا نافذ کردہ لازمی فیصلہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم اس کو اس کی ناپسندیدہ حالت سے نکال سکیں۔ پھر انصاف کے قیام کا جذبہ آخر کیوں کر پیدا ہوگا۔

سائنٹفک دنیا اسی عقیدہ میں ایک اور سبب سے مبتلا ہے۔ یہ ارتقاء (evolution) کا نظریہ ہے۔ حیاتیاتی ارتقاء کا نظریہ زندگی کی مختلف انواع (species) کی توجیہہ کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کو "فرق" کی توجیہہ بھی کرنی پڑی۔ چنانچہ علماء ارتقاء نے یہ نظریہ بنایا کہ ارتقاء کے عمل میں کچھ انسانی گروہ آگے بڑھ گئے اور کچھ لوگ پیچھے رہ گئے۔ مثال کے طور پر، عورت کے بارہ میں ڈارون کا کہنا ہے کہ وہ ارتقاء کے عمل کے دوران ابتدائی درجہ پر باقی رہ گئی۔ مرد آخر کار عورت کے اوپر فائق ہو گیا:

Man has ultimately become superior to woman.

افریقہ کے سیاہ فام یا بعض علاقوں کے پستہ قد لوگ وہ انسانی نسلیں ہیں جو ارتقائی عمل میں دوسروں سے پیچھے رہ گئیں۔ اس طرح سائنٹفک دنیا بھی، اپنے اس عقیدہ کے مطابق، مفروضہ پچھڑی

ہوئی نسلوں کے بارہ میں ہمدرد نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس کا عقیدہ اس کے اندر جو مزاج پیدا کرتا ہے وہ یہی ہے۔

اس قسم کے مفروضات کی بنیاد پر وہ نظریہ نکلا جس کو ان کی اپنی غلطی (Their own fault) کہا جاتا ہے۔ یعنی جو لوگ کسی دوسرے کی طرف سے نابرابری کے سلوک کا تجربہ کر رہے ہیں وہ خود ان کی اپنی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ گویا کہ ظلم مظلوم کی اپنی تقدیر ہے۔ اس کے لیے ظالم قصور وار نہیں (15/363)

اسلام آیا تو اس نے مکمل طور پر اس قسم کے تمام نظریات کو منہدم کر دیا۔ اسلام نے مسلسل مختلف طریقوں سے یہ تصور پیش کیا کہ ظاہری فروق کے باوجود تمام انسان برابر ہیں۔ سب کو یکساں عزت اور انصاف کا حق حاصل ہے۔ کوئی انسان نہ کسی سے برتر ہے اور نہ کوئی انسان کسی سے کمتر۔ یہاں اس سلسلہ میں دو حوالے نقل کیے جاتے ہیں۔ قرآن میں اعلان کیا گیا ہے :

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ ان اللہ علیم خبیر (الحجرات ۱۳)	اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے۔

قرآن کی اس آیت کے مطابق، انسانوں میں رنگ اور نسل کا جو فرق ہے وہ تعارف کے لیے ہے نہ کہ امتیاز کے لیے۔ انسان اپنی اصل کے اعتبار سے سب کے سب ایک ہیں۔ ان میں امتیاز کی بنیاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف کیرکٹر ہے۔ قابل عزت وہ ہے جو خدا پرست ہے۔ جو خدا اور بندوں کے حقوق کو پہچانتا ہے اور ان کو ٹھیک ادا کرتا ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں خطبہ دیا۔ آپ ایام تشریق میں اپنے اونٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت آپ نے جو باتیں فرمائیں ان میں سے ایک بات یہ تھی :

یا ایھا الناس ألا إن ربکم واحد وإن اباکم واحد۔ ألا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی	اے لوگو سن لو، بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ سن لو کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی

ولا لاسود علی احمر ولا لاحمر علی اسود الا بالتقوی۔ الا ھل بلغت۔ قالوانعم۔ قال فلیبلغ الشاھد الغائب (الجامع لاحکام القرآن ۱۶/ ۳۴۲)

فضیلت نہیں۔ اور کسی کالے کو کسی سرخ پر کوئی فضیلت نہیں اور کسی سرخ کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ جو کچھ فضیلت ہے تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ کیا میں نے تم کو پہنچا دیا۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ جو حاضر ہے وہ غیر حاضر کو یہ بات پہنچا دے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان اپنی عمر کے آخری سال کیا تھا۔ اس وقت پورا عرب فتح ہو چکا تھا۔ اس لیے آپ کا یہ اعلان محض ایک مصلح کا اعلان نہ تھا، بلکہ حاکمِ وقت کا اعلان تھا۔ یہ اعلان نہ صرف ایک اصولِ مساوات کے طور پر سنا گیا بلکہ عین اسی وقت وہ بالفعل قائم اور نافذ بھی ہو گیا۔

اس اعلان کے مطابق، آپ نے تمام لوگوں کو بتایا کہ اس دنیا کا جس طرح خالق ایک ہے۔ اسی طرح تمام انسان ایک ہی باپ اور ماں سے پیدا ہوئے ہیں۔ تمام انسان ایک ہیں۔ تمام انسان آپس میں بھائی اور بہن ہیں۔ ان میں ظاہری اعتبار سے فرق ہو سکتا ہے مگر عزت اور احترام اور قانونی انصاف کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔

جہاں تک انسانوں میں ظاہری درجات کا تعلق ہے، اسلام نے بتایا کہ یہ درجات آزمائش کے لیے ہیں نہ کہ امتیاز کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تمام انسانوں کو امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ کسی انسان کو جو سامان یا جو حیثیت ملتی ہے وہ اس کے لیے سامانِ آزمائش ہے، وہ گویا اس کے لیے امتحان کا پرچہ ہے۔ اس دنیا میں کمی بھی ایک امتحانی حالت ہے اور زیادتی بھی ایک امتحانی حالت۔ ایک حیثیت بھی امتحان کے لیے ہے اور دوسری حیثیت بھی امتحان کے لیے۔ اس لیے آدمی کو ساری نظر اس پر رکھنا چاہیے کہ وہ اپنے امتحان میں پورا اتر رہا ہے یا نہیں۔ نہ کہ اپنی حالت کو دیکھ کر وہ احساسِ کمتری یا احساسِ برتری میں مبتلا ہو جائے (الفجر)

سائنسی تصدیق

موجودہ زمانہ میں انسانی نسلوں کے بارہ میں جو نئی نفسیاتی اور حیاتیاتی تحقیقات ہوئی ہیں انھوں نے اسلام کی واضح تصدیق کی ہے اور دوسرے نظریات کو خالص علمی اعتبار سے رد کر دیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مالیکولر بیالوجی (Molecular biology) نے تحقیق کا نیا میدان

کھول دیا ہے۔ چنانچہ امریکہ میں جینیٹکس کے ماہرین کی ایک ٹیم نے باقاعدہ ریسرچ کے ذریعہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ انسانیت کے مشترک جد اعلیٰ (common ancester) کو دریافت کریں۔

اس ٹیم نے جینیی شہادت (Genetic evidence) کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تمام انسانوں کے جد اعلیٰ ایک تھے۔ رنگ وغیرہ کا فرق جو بظاہر دکھائی دیتا ہے وہ محض اضافی ہے۔ اس کا نسلی علاحدگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے مطابق تمام انسان ایک عظیم خاندان (Great family) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تمام لوگ ایک ہی حیاتیاتی اخوت (biological brotherhood) کے رشتہ میں بندھے ہوئے ہیں (نیوز ویک ۱۱ جنوری ۱۹۸۸)

اس موضوع پر موجودہ زمانہ میں کثرت سے کتابیں اور تحقیقی مقالات شائع ہوئے ہیں۔ یونیسکو کے زیر اہتمام ایک کتاب چھپی ہے جو کہ حسب ذیل ہے :

J Comas, The Race Question in Modern Science, 1956.

اس کتاب کا باب نسلی توہمات (Racial Myths) اس ضمن میں خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے۔

محرک کا مسئلہ

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ ان علمی تحقیقات کے باوجود ایسا کیوں ہے کہ دنیا کی عملی صورت حال میں کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوا۔ جن قوموں نے اپنے کو اعلیٰ سمجھ لیا تھا، وہ آج بھی اپنے کو اعلیٰ سمجھے ہوئے ہیں۔ اور ان قوموں کے ساتھ نئی نئی صورتوں میں ناانصافی کی جارہی ہے جن کو قدیم تصور کے تحت کمتر سمجھ لیا گیا تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ سماجی انصاف کے معاملہ میں صرف ایک نظریہ کا پایا جانا کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ ایک طاقت ور محرک کا ہونا بھی انتہائی ضروری ہے۔ اور طاقت ور محرک اسلام کے سوا کہیں اور موجود نہیں۔ اسلام نے جس طرح ایک کامل نظریہ دیا ہے، اسی طرح وہ اس معاملہ میں ایک انتہائی طاقت ور محرک بھی انسان کو دیتا ہے۔

قرآن میں ایک طرف عدل کا حکم دیا گیا ہے (النحل ۹۰) اور دوسری طرف مکافات عمل کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ خبر دی گئی ہے کہ انسان کے تمام اعمال کی مکمل ریکارڈنگ کی جارہی ہے۔ موت کے بعد ہر آدمی اللہ کی عدالت میں کھڑا کیا جائے گا۔ وہاں ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ کوئی

بھی شخص، اگر وہ ظلم کرتا ہے تو وہ اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔ وہ وقت بہر حال آنا ہے جب کہ ہر آدمی اپنے کیے کا انجام بھگتے، خواہ اس نے ایک ذرہ کے برابر ظلم کیوں نہ کیا ہو (الزلزال)

یہ مسئولیت (accountability) کا نظریہ آدمی کو آخری حد تک چوکنا کر دیتا ہے۔ یہ فکر جس کے سینہ میں جاگ جائے وہ انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں سخت محتاط ہو جاتا ہے۔ وہ خود اپنے بچاؤ کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ ہر ایک ساتھ انصاف کرے۔ وہ لوگوں کے ساتھ زیادتی کرنے سے پوری طرح اپنے آپ کو بچائے۔

عام حالات میں سماجی انصاف محض دوسروں کی ضرورت رہتا ہے۔ مگر مسئولیت کا عقیدہ سماجی انصاف کو خود اپنی ضرورت بنا دیتا ہے۔ اور کون ہے جو خود اپنی ضرورت کے بارہ میں غافل ہو جائے۔

مسئولیت کا عقیدہ اتنا شدید چیک ہے کہ ظلم تو درکنار، ظلم کے شائبہ سے بھی آدمی بچنے لگتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار اپنی اہلیہ ام سلمہؓ کے حجرے میں تھے۔ آپ نے کسی کام کے لیے خادمہ کو بھیجا۔ وہ باہر گئی تو وہاں کھیل کود دیکھنے لگی اور واپسی میں دیر کر دی۔ کافی دیر کے بعد وہ واپس آئی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک مسواک تھی۔ آپ کے چہرے پر غصہ کے آثار ظاہر ہو گئے۔ تاہم آپ نے خادمہ سے صرف یہ کہا کہ اگر مجھے قیامت میں بدلہ کا ڈر نہ ہوتا تو میں تجھ کو اس مسواک سے مارتا (لولا خشية القود لاوجعتك بهذا السواك)

قدیم زمانہ میں خادم کو مارنا مالک کا فطری حق سمجھا جاتا تھا۔ مگر اسلام نے جو ذہن بنایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلطی کے باوجود مسلمان اپنے خادم کو مارنے سے احتراز کرتے تھے۔ کیونکہ یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ ان کا یہ فعل کہیں خود اپنی بازپرس کا سبب نہ بن جائے۔

ایک صحابی ابو مسعود انصاری ایک بار کسی غلطی پر اپنے غلام کو مارنے لگے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے۔ آپ نے فرمایا کہ اے ابو مسعود، جان لو کہ جتنی قدرت تم کو اس غلام پر ہے، اس سے زیادہ قدرت تمہارے اوپر خدا کو ہے (اعلم ابامسعود، لله اقدر عليك منك على هذا الغلام) یہ سنتے ہی ابو مسعود کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ کر گر پڑا۔ انھوں نے غلام سے کہا کہ جاؤ تم آزاد ہو۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ظاہری فرق کو مٹا کر ہر آدمی کو عین اسی مقام پر کھڑا

کر دیتا ہے جہاں وہ دوسرے کو کھڑا ہوا پاتا ہے۔ ابومسعود اپنے اور غلام کے درمیان فرق دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بڑا اور طاقت ور سمجھ رہے تھے اور غلام کو چھوٹا اور کمزور۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حقیقت کی یاد دہانی کرائی تو ان کو معلوم ہوا کہ جہاں میں نے غلام کو کھڑا کر رکھا ہے وہیں میں خود بھی کھڑا ہوا ہوں کیونکہ اصل مقابلہ انسان اور انسان کا نہیں ہے بلکہ انسان اور خدا کا ہے۔ اور خدا کے مقابلہ میں میں بھی اتنا ہی چھوٹا ہوں جتنا چھوٹا کہ میں اپنے غلام کو سمجھ رہا ہوں۔

ایک اور دوسرے میں فرق کا احساس سماجی ناانصافی پیدا کرتا ہے۔ جب ایک اور دوسرے کا فرق مٹ جائے تو اس کے بعد سماجی ناانصافی کا بھی لازمی طور پر خاتمہ ہو جائے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ظلم اور سماجی بے انصافی کے تمام واقعات انسانوں کے اندر نابرابری کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسانوں میں بظاہر کوئی طاقت ور ہوتا ہے اور کوئی کمزور، کوئی دولت مند ہوتا ہے اور کوئی غریب۔ اب طاقت ور اور دولت مند اپنے آپ کو کمزور اور غریب سے اونچا سمجھ لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے اوپر جو دست درازی چاہوں کروں، وہ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ میری برتر حیثیت اس کے مقابلہ میں ہر دفاع کے لیے کافی ہے۔

مگر اسلام بتاتا ہے کہ ہر انسان کا معاملہ خدا کا معاملہ ہے۔ ہر قضیہ آخر کار خدا کے سامنے پیش ہونے والا ہے۔ خدا تمام طاقت وروں سے زیادہ طاقت ور ہے۔ وہ کامل انصاف کے ساتھ ہر ایک کے اوپر اپنا فیصلہ نافذ کرے گا اور پھر کسی کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ خدا کے فیصلہ کی زد میں آنے سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

اس طرح ہر معاملہ انسان اور انسان کے درمیان کا معاملہ نہ ہو کر خدا اور انسان کے درمیان کا معاملہ بن جاتا ہے۔ ایک طرف خدا ہوتا ہے اور دوسری طرف تمام انسان۔ اور جب تقسیم خدا اور انسان کی ہو جائے تو کوئی بھی طاقت ور نہیں رہتا۔ ہر آدمی اپنے آپ کو اسی عجز کی حالت میں محسوس کرنے لگتا ہے جہاں اس سے پہلے وہ دوسرے کو فرض کیے ہوئے تھا۔

یہ بلاشبہ سماجی انصاف کا سب سے زیادہ طاقت ور محرک ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ احساس پیدا ہو جائے وہ کسی حال میں دوسرے کے اوپر ناانصافی کی جرأت نہیں کر سکتا۔

ایک ایسا معاشرہ جس میں خدا کو نہ مانا جاتا ہو وہاں اس قسم کا چیک ممکن نہیں۔ خدا کو نہ ماننے کی

صورت میں مسئلہ انسان اور انسان کے درمیان رہتا ہے۔ اور جب مسئلہ انسان اور انسان کے درمیان ہو تو کسی بھی طرح انسان کو اِس پر مطمئن نہیں کیا جا سکتا کہ ایک اور دوسرے کے درمیان فرق نہیں ہے۔ کیونکہ فرق تو واقعہ میں موجود ہے اور پوری طرح موجود ہے۔

انسانوں کے درمیان فرق کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ فرق کے اثر کو ختم کیا جا سکتا ہے، اور وہ اس طرح کہ معاملہ کو انسان اور انسان کا معاملہ بنانے کے بجائے اس کو انسان اور خدا کا معاملہ بنا دیا جائے۔ ہر انسان یہ سمجھنے لگے کہ تمام انسانوں کے اوپر ایک خدا ہے اور تمام معاملات کو آخر کار اسی کے یہاں جانا ہیں۔ اس کے فیصلہ کو رد کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

اسلام کے سوا دوسرے جن مذاہب میں خدا کا تصور ہے، وہ تحریف کی بنا پر عملاً اس مقصد کے لیے غیر موثر ہو گیا ہے۔ مثلاً مسیحیت میں خدا کا بیٹا سولی پر چڑھ کر تمام انسانوں کے گناہ کا کفارہ بن چکا ہے۔ یہودیت میں نجات ایک گروہ کا حق ہے جس کی بخشش پیشگی طور پر ہو چکی ہے۔ ہندو ازم میں خدا کا عقیدہ وحدت الوجود (monism) کی صورت میں ہے۔ جو کہ عملاً بے فائدہ ہے۔

اسلامی توحید میں خدا علحدہ ہستی ہے اور تمام انسان اس کے بندے اور مخلوق ہیں۔ اس عقیدہ سے آدمی کے اندر عجز کا تصور ابھرتا ہے۔ اس کے برعکس ہندو ازم میں خدا ہی واحد حقیقت ہے۔ انسان کوئی علحدہ وجود نہیں۔ انسان خود بھی خدا کے وسیع تر وجود کا ایک جزء ہے۔ یہ عقیدہ برعکس طور پر برتری کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ اسلامی توحید "میں بندہ ہوں" کا احساس جگاتی ہے، جب کہ ہندو عقیدہ "میں خدا ہوں" کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔ اول الذکر سے عجز کی نفسیات پیدا ہوتی ہے اور ثانی الذکر سے گھمنڈ کی نفسیات۔ اور جس سماج کے افراد اپنے اندر گھمنڈ کی نفسیات لیے ہوئے ہوں وہاں سماجی انصاف کا ماحول پیدا کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔

جدید تدبیروں کی ناکامی

۳۰ سال پہلے ایمنسٹی (Amnesty International) کا ادارہ قائم کیا گیا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر لندن میں تھا۔ اس کو انسانی حقوق کا چوکیدار (Human rights watchdog) سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس مدت میں وہ اخباری رپورٹوں کے سوا اور کوئی بھی حقیقی خدمت انجام نہ دے سکا۔ دسمبر ۱۹۹۱ میں اس کی عمر کے ۳۰ سال پورے ہو گئے مگر ادارہ کی طرف سے اس کی کوئی تقریب نہیں منائی گئی۔ ادارہ کی

خاتون نمائندہ فرینکا سیوٹو (Ms Franca Siuto) سے پوچھا گیا کہ آپ کا ادارہ ۲۰ سال پورے ہونے پر کیا کوئی تقریب منائے گا۔ انھوں نے کہا حقیقت یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی چیز تقریب منانے کے لیے نہیں :

There isn't really anything to celebrate.

ہر سال ۱۰ دسمبر کو اقوام متحدہ کی طرف سے "یوم حقوق انسانی" منایا جاتا ہے۔ اس سال اس موقع پر اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل جیویر پریز ڈی کوئیار (Javier Peres de Cuellar) نے جو بیان جاری کیا، اس میں انھوں نے دنیا بھر میں طاقت کے اندھا دھند استعمال اور انسانوں کے ساتھ ہونے والے وحشیانہ سلوک پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ ۴۳ سال پہلے اقوام متحدہ کے تحت منظور شدہ اعلان حقوق انسانی (یونیورسل ڈکلریشن آف ہیومن رائٹس) کے باوجود اب بھی بڑے پیمانہ پر اس کی خلاف ورزی کی جارہی ہے (نیشنل ہیرالڈ ۱۱ دسمبر ۱۹۹۱)

امن اور انصاف کے قیام میں ان اداروں کی ناکامی کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسانی زندگی میں امن اور انصاف اپیلوں یا اخباری بیانوں سے قائم نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ اس کے موافق ایک صحیح آئیڈیالوجی ہو، اس آئیڈیالوجی کی بنیاد پر لوگوں کے اندر فکری انقلاب لایا جائے۔ پھر یہ اصلاح یافتہ لوگ سماجی اداروں کو درست کریں اور اگر حکومت ان کے قبضہ میں آجائے تو حکومت کے ذریعہ سماج کے اندر امن وانصاف قائم کریں۔

ان شرطوں کو تاریخ میں ایک ہی بار کامل طور پر پورا کیا گیا۔ یہ پورا کرنے والے پیغمبر اسلامؐ اور آپ کے اصحاب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ امن وانصاف پر مبنی ایک حقیقی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس قسم کی کامیابی نہ اس سے پہلے کسی کو ملی اور نہ اس کے بعد۔

مساویانہ انصاف کا نمونہ

سوشل جسٹس کے معاملہ میں اسلام کا تیسرا اعظیم کنٹری بیوشن یہ ہے کہ اس نے مساویانہ انصاف کا ایک کامل تاریخی نمونہ قائم کر دیا ہے۔ عام خاندانی اور سماجی زندگی سے لے کر حکومت اور اقتدار تک ہر مرحلہ میں اس اصول کو عملاً برت کر دکھا دیا گیا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ ہر انسان یکساں عزت کا مستحق ہے۔ اور ہر انسان سے یکساں گرفت کی جائے گی، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔

اسلام کی تاریخ اس عملی نمونہ کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ اسلامی تاریخ کی کسی بھی کتاب میں ان کو دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں چند واقعات کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ زینب بنت جحش (وفات ۲۰ھ) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کی لڑکی تھیں اور قریش کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ قدیم زمانہ میں کسی اعلیٰ خاندان کی لڑکی کا نکاح کسی غلام کے ساتھ ناقابل تصور تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کو توڑنے کے لیے یہ فیصلہ فرمایا کہ زینب کا نکاح ایک غلام کے ساتھ کیا جائے۔ چنانچہ ایک حبشی غلام زید بن حارثہ کے ساتھ آپ نے سیدہ زینب کا نکاح کر دیا۔ قدیم زمانہ میں یہ انتہائی انوکھا واقعہ تھا۔ کیوں کہ غلام کا نکاح آزاد سے کرنا قدیم زمانہ میں بالکل ناقابل تصور تھا۔

۲۔ کعبہ ایک مقدس عبادت خانہ تھا۔ اس کی چھت پر صرف شریف قبیلہ کے افراد ہی چڑھ سکتے تھے۔ نیچے طبقہ کے کسی فرد کا کعبہ کی چھت پر چڑھنا قدیم زمانہ کے لوگوں کو کسی طرح گوارا نہ تھا۔ مکہ فتح ہوا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کو اس طرح توڑا کہ حبشی غلام بلال بن رباح کو حکم دیا کہ وہ کعبہ کی چھت پر چڑھیں اور اس کے اوپر کھڑے ہو کر اذان دیں۔

یہ عرب کی تاریخ میں (اور ساری قدیم دنیا کی تاریخ میں) انوکھا واقعہ تھا۔ اگر اسلام غالب نہ آچکا ہوتا تو اس "گستاخی" پر یقیناً لوگ بلال کو مار ڈالتے۔ تاہم ان کے سخت تبصروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے انھیں کتنا سخت جھٹکا لگا تھا۔ مکہ کے عتاب بن اسید نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ میرا باپ مر گیا اور آج وہ اس منظر کو دیکھنے کے لیے موجود نہیں (الحمد للہ الذی قبض ابی حتی لا یری ھذا الیوم) الحارث بن ہشام نے کہا کہ کیا محمد کو اس کالے کوّے کے سوا کوئی اور موذن نہیں ملتا تھا (ما وجد محمدٌ غیرَ ھذا الغراب الاسود موذناً) (الجامع لاحکام القرآن ۱۶/۳۴۱)

۳۔ خلیفہ چہارم علی بن ابی طالب کی ایک زرہ گم ہوگئی۔ اس کے بعد وہ کوفہ کے ایک نصرانی کے یہاں برآمد ہوئی۔ یہ معاملہ وقت کے قاضی شریح بن الحارث کی عدالت میں پیش ہوا۔ علی بن ابی طالب عام شہری کی طرح ان کی عدالت میں گئے۔ حضرت علیؓ نے اپنے بیٹے کو گواہی میں پیش کیا تو قاضی نے اس کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر نہیں۔

خلیفہ وقت عدالت سے اپنا مقدمہ ہار گئے۔ تاہم نصرانی اس بات سے بہت متاثر ہوا کہ اسلام

کی عدالت میں خلیفہ اور عام شہری کے درمیان اس قدر برابری کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ اس نے خود سے اقرار کر لیا کہ علی بن ابی طالب سچے ہیں اور یہ زرہ واقعۃً انھیں کی ہے۔ یہ میری نہیں (عظمت صحابہ ۲۲-۲۴)

۴۔ خلیفہ ثانی عمر فاروق کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ مصر کے حاکم عمرو بن العاص کے لڑکے محمد بن عمرو ایک قبطی پر غصہ ہو گئے اور اس کو کوڑے سے مارا۔ یہ قبطی مصر سے چل کر مدینہ آیا اور عمر فاروق سے فریاد کی۔ عمر فاروق نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ محمد بن عمرو نے اس کو ناحق مارا ہے۔ انھوں نے فوراً اپنا آدمی مصر بھیج کر حاکم مصر اور ان کے لڑکے کو بلایا۔ جب وہ آ گئے تو قبطی سے کہا کہ ان کو مارو۔

قبطی نے حاکم مصر کی موجودگی میں ان کے لڑکے کو مارنا شروع کیا اور ان کو لہولہان کر دیا۔ جب وہ پوری طرح مار چکا تو عمر فاروق نے عمرو بن العاص اور محمد بن عمرو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا، حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا (عظمت صحابہ ۴۰-۴۱)

۵۔ فلسطین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں فتح ہوا۔ مفتوحہ قوم سے معاہدہ طے کرنے کے یہ مقرر ہوا کہ خلیفہ خود فلسطین آئیں۔ عمر فاروق مدینہ سے روانہ ہوئے۔ وہ اس طرح چلے کہ ان کے جسم پر معمولی کپڑا تھا اور ایک خادم اور ایک اونٹ۔ انھوں نے اپنے خادم سے کہا کہ اگر میں تنہا اونٹ پر بیٹھوں اور تم پیدل چلو تو میں تمہارے اوپر ظلم کروں گا۔ اگر تم اونٹ پر بیٹھو اور میں پیدل چلوں تو تم میرے اوپر ظلم کروگے۔ اور اگر ہم دونوں اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ جائیں تو ہم اونٹ کے اوپر ظلم کریں گے۔ بہتر ہے کہ ہم تینوں باری مقرر کر لیں۔

چنانچہ تین باری مقرر ہوئی ایک بار عمر فاروق بیٹھتے اور خادم پیدل چلتا۔ پھر خادم بیٹھتا اور عمر فاروق پیدل چلتے۔ اس کے بعد اونٹ خالی رہتا اور دونوں پیدل چلتے۔ خلیفہ دوم اس طرح سفر کرتے ہوئے مدینہ سے فلسطین پہنچے۔ (تعمیر کی طرف ۵۶-۵۷)

اسلام نے اس طرح اپنے فکری انقلاب اور اپنے عملی نمونوں کے ذریعہ ایک ایسی تاریخ پیدا کی جس نے زمین کے تقریباً تمام آباد حصہ کو متاثر کیا۔ یہ انقلاب اتنا طاقت ور تھا کہ اس کے اثرات ہزار سال بعد تک بھی ختم نہ ہو سکے۔

اسلامی انقلاب کی ہمہ گیری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ اور تابعین کا زمانہ اسلام میں زرّیں زمانہ ہے۔ اس زمانہ

میں اسلام کی اقدار پوری طرح سماج کے اوپر چھائی رہیں۔ بعد کی نسلوں میں جب اس انقلاب کے اثرات کم ہوئے اس وقت بھی ماحول میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ آسکی۔ حتیٰ کہ مسلم بادشاہوں کو بھی اس سے سرتابی کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

اسلام کے ذریعہ توحید کا جو انقلاب آیا اس نے خدا کا رب ہونا اور انسان کا صرف عبد ہونا اتنے طاقت ور انداز میں لوگوں کے ذہنوں پر راسخ کر دیا کہ کسی کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ دولت یا اقتدار پاکر اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ وارفع سمجھنے لگے، جیسا کہ پچھلی تاریخ میں ہوا کرتا تھا۔

نصر بن احمد بن اسد بن سامان (م ۲۷۹ھ) دولت السامانیہ (Samanids) کا بانی ہے۔ یہ حکومت ایران یا ماوراء النہر (Transoxania) میں ۸۱۹ء سے ۹۹۹ء تک قائم رہی۔

سلطان نصر نے جب نیشاپور کو فتح کر کے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کیا تو وہاں اس نے ایک شاندار دربار منعقد کیا۔ تخت نشینی کی رسم کے افتتاح کے لیے ایک حافظ سے تلاوت کرائی گئی۔ وہ تلاوت کرتے ہوئے اس آیت پر پہنچے : یوم ھم بارزون لا یخفی علی اللّٰہ منھم شیٔ۔ لمن الملک الیوم۔ للّٰہ الواحد القھار (المومن ۱۶) حافظ قرآن نے جب یہ آیت پڑھی تو اس کو سن کر سلطان نصر کے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ شدتِ احساس کے تحت وہ تخت سے نیچے آگیا۔ اس نے تاج کو اپنے سر سے اتارا اور زمین پر سجدہ میں گر گیا۔ اس نے کہا : اے میرے رب، بلاشبہہ بادشاہی تیری ہے نہ کہ میری۔

قدیم زمانہ شاہی مطلق العنانی کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ کے غالب فکر میں بادشاہ کی برتری اور بقیہ انسانوں کی کمتری ایک مسلّمہ کا درجہ اختیار کر گئی تھی۔ اس کا اثر عملی واقعات پر پڑتا تھا۔ اسلامی انقلاب نے شخصی بڑائی کے دور کو ختم کیا۔ اس نے انسانی برابری کے تصور کو ایک مسلّمہ کی حیثیت سے تاریخ میں رواج دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی اعمال اِس فکر کے زیرِ اثر انجام پانے لگے۔

پوری اسلامی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں موضوع کی نسبت سے میں دورِ آخر کے ایک واقعہ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ یہ مغل بادشاہ جہانگیر کا واقعہ ہے۔ اس واقعہ کو مورخ اسلام مولانا شبلی نعمانی نے "عدل جہانگیری" کے عنوان سے نظم کیا ہے۔ یہ پوری نظم اگلے صفحہ پر نقل کی جا رہی ہے :

قصرِ شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گزر
ایک دن نورجہاں بام پہ تھی جلوہ فگن

کوئی شامت زدہ رہ گیر اُدھر آنکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن

غیرتِ حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور و کفن

ساتھ ہی شاہِ جہانگیر کو پہنچی جو خبر
غیظ سے آگئی ابروے عدالت پہ شکن

حکم بھیجا کہ کنیزانِ شبستانِ شہی
جا کے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن

نخوتِ حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
میری جانب سے کرو عرض بہ آئینِ حسن

ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں
مجھ سے ناموسِ حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن

اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اُس کو ہلاک
کشورِ حسن میں جاری ہے یہی شرعِ کہن

مفتیِ دیں سے جہانگیر نے فتویٰ پوچھا
کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن

مفتیِ دین نے بے خوف و خطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اُڑا دو گردن

لوگ دربار میں اِس حکم سے تھرّا اٹھے
پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن

ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جا کر
پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن

پھر اُسی طرح اُسے کھینچ کے باہر لائیں
اور جلاّد کو دیں حکم کہ ہاں تیغ بزن

یہ وہی نورجہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہانگیر کے پردہ میں شہنشاہِ زمن

اِس کی پیشانیِ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن

اب نہ وہ نورجہاں ہے نہ وہ اندازِ غرور
نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدۂ صبر شکن

اب وہی پاؤں ہر اک گام پہ تھرّاتے ہیں
جن کی رفتار سے پامال تھے مرغانِ چمن

ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن

خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام
خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرِ حسن

مفتیِ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا
بولے جائز ہے، رضامند ہوں گر بچّہ و زن

وارثوں کو جو دیے لاکھ درم بیگم نے
سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہِ زمن

ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص
قتل کا حکم جو رُک جائے تو ہے مستحسن

ہو چکا جب کہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں
کہ نہیں اس میں کوئی شائبۂ حیلہ و فن

اٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم
تھی جہاں نورجہاں معتکفِ بیتِ حزن

دفعتاً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا
تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من

مغل بادشاہ جہانگیر کے زمانہ میں یہ واقعہ ہوا کہ اس کی ملکہ نور جہاں نے ایک غریب آدمی کو بے گناہ قتل کر دیا۔ یہ معاملہ عدالت میں پیش ہوا۔ اسلامی قاضی نے فیصلہ کیا کہ مقتول کے بدلے قاتل (نور جہاں) کو قتل کر دیا جائے۔ بادشاہ یا ملکہ کسی کو ہمت نہیں ہوئی کہ قاضی کے فیصلہ کو ماننے سے انکار کرے۔ یہاں تک کہ خود اسلامی قانون ہی کی ایک اور دفعہ کے تحت معاملہ کو طے کیا گیا۔

اب اس کے مقابل کی مثال لیجئے۔ ہندستانی حکمراں جہانگیر (۱۶۲۷ - ۱۵۶۹) کا ہم عصر برطانیہ کا حکمراں جیمز فرسٹ (۱۶۲۵-۱۵۶۶) تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں قانون سے اوپر ہوں۔ میں ذاتی رائے سے جو چاہوں فیصلہ کر سکتا ہوں۔ اس زمانہ کے برطانی چیف جسٹس سر ایڈورڈ کوک (۱۶۳۴-۱۵۵۲) نے اس سے اختلاف کیا۔

جان بیٹ (John Bate) ایک برٹش مرچنٹ تھا۔ اس نے ایک بار امپورٹڈ کمشش پر ٹیکس دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ پارلیمنٹ نے ایسا قانون نہیں بنایا تھا۔ بلکہ جیمز فرسٹ نے ذاتی فرمان سے اس کو جاری کیا تھا۔ جسٹس کوک نے جان بیٹ کی حمایت کی۔ اس پر بادشاہ غصہ ہو گیا۔ اس نے کہا کہ کیا میں قانون کے ماتحت ہوں۔ یہ تو غداری ہے :

Am I subject to the law. To say so is treason.

جسٹس کوک اپنے نظریہ پر قائم رہے۔ اس کے نتیجہ میں بادشاہ نے ان کو جج کے عہدہ سے ہٹا دیا۔ ان کے بارہ میں تاریخ بتاتی ہے کہ بادشاہ سے ان کے قانونی اختلافات ہوئے اور آخر کار انھوں نے اپنا عہدہ کھو دیا :

That eventually broke his judicial career. (4/825)

جس وقت بادشاہ اور جسٹس کوک کا کیس برطانیہ کی پریوی کونسل میں آیا تو اس وقت کے اٹارنی جنرل فرانسس بیکن (Francis Bacon) نے بادشاہ کی قانونی بالاتری کی حمایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ججوں کو شیر ہونا چاہیے مگر انھیں ایسے شیر ہونا چاہیے جو شاہی تخت کے ماتحت ہوں :

Judges should be lions, but yet lions under the throne. (1/92)

پچھلے تمام زمانوں میں قانون کی دو قسمیں تھیں۔ اس کو برطانیہ کی قانونی روایات میں عوامی قانون (common law) اور شاہی قانون (Royal prerogative) کہا جاتا ہے۔ اس کے

مطابق عوام کے لیے ایک قانون تھا اور بادشاہوں اور اعلیٰ خاندان کے لوگوں کے لیے دوسرا قانون۔ بادشاہ کی زبان قانون ہوتی تھی۔ وہ ہر قانون سے بالاتر تھا۔ یہ اسلام ہے جس نے معلوم تاریخ میں پہلی بار قانون کی اس تقسیم کو توڑا اور تمام لوگوں کے لیے یکساں قانون جاری کیا۔ اب شاہی قانون (rule of king) ختم ہوگیا اور ہر آدمی بشمول بادشاہ قانون کی حکمرانی (rule of law) کے تحت آگیا۔

تاریخ پر اثرات

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری سال حج ادا فرمایا۔ اس موقع پر آپ نے وہ خطبہ دیا جو خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ اس خطبہ میں آپ نے جو تاریخی اعلانات فرمائے ان میں سے ایک اعلان یہ تھا :

الا کل شیئ من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع۔ سن لو، جاہلیت کے معاملہ کی ہر چیز میرے قدموں کے نیچے پامال کردی گئی۔

ان الفاظ میں آپ نے ایک نئے دور کا اعلان فرمایا جو اللہ کی مدد سے آپ کے ذریعہ تاریخ انسانی میں ظاہر ہوا۔ آپ کے ذریعہ تاریخ میں وہ اسباب پیدا کیے گئے جس کے بعد یہ ناممکن ہوگیا کہ کوئی جاہلی طریقہ انسانی زندگی میں اپنی جڑ قائم کر سکے۔

اسلام عرب سے نکل کر مختلف ملکوں میں پھیلا۔ دنیا کا بہت بڑا حصہ اہل اسلام کے زیر اقتدار آگیا۔ مگر کہیں بھی وہ نسلی تفریق ظہور میں نہ آسکی جو دوسری قوموں اور تہذیبوں کے عروج کے زمانہ میں پیدا ہوئی۔ اسی زمانہ میں افریقہ کے بیشتر باشندوں نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ سب سیاہ فام تھے اور اسلام سے پہلے انھیں پیدائشی غلام سمجھا جاتا تھا۔ مگر اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا گیا۔ اسلام میں داخل ہوکر وہ یکساں طور پر اسلامی برادری کا حصہ بن گئے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے افریقہ اور دوسرے علاقوں میں اسلام کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے اس تاریخی حقیقت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے کہ مسلم ملکوں میں سے کسی ملک میں بھی نسل کی بنیاد پر ذات کا نظام کبھی قائم نہ ہو سکا :

None of the Muslim countries ever developed a racial caste system. (15/361)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا ظہور دنیا میں ایک سماجی انقلاب کا ظہور تھا۔ یہ تاریخی تبدیلی اوّلاً عرب اور اطراف عرب میں آئی۔ اس کے بعد اس کے اثرات تمام دنیا میں پھیل گئے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ انسانی سماج سے آزاد اور غلام کی تقسیم ہمیشہ کے لیے نابود ہو گئی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے دنیا میں قانون کی حکمرانی کا دور شروع ہوا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ سماجی نابرابری یا سماجی ناانصافی کو جائز ٹھہرانے والے تمام فلسفے دنیا سے ختم ہو گئے۔

یہ تاریخی تبدیلی اس حد تک موثر ہوئی ہے کہ اب اگر کوئی سرپھرا شخص دوبارہ انسانیت کے بارہ میں اس قسم کا تفریقی نظریہ لے کر اٹھتا ہے تو وہ اپنے آپ مٹ کر رہ جاتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں اس کی ایک مثال ہٹلر (۱۹۴۵-۱۸۸۹) ہے۔ ہٹلر کے نزدیک جرمن نسل سب سے عظیم (greatest) نسل تھی۔ اس نے کہا کہ جرمن نسل کا یہ پیدائشی حق ہے کہ وہ تمام دوسری قوموں کے اوپر حکومت کرے۔ اس کا خیال تھا کہ نسلوں اور افراد کے درمیان نابرابری ایک ناقابل تغیر فطری نظام ہے۔ اس نے آرین نسل کو انسانیت کا واحد تخلیقی عنصر قرار دیا :

> He regarded inequality between races and individuals as part of unchangeable natural order and exalted the Aryan Race as the sole creative element of mankind. (8/967)

مگر ہٹلر کا انجام کیا ہوا وہ وقتی طور پر یورپ میں ابھرا۔ مگر آخر کار وہ خود اپنے ملک میں تنہا رہ گیا اور مایوسی کے عالم میں برلن کے ایک بنکر میں خودکشی کر لی۔ اس کے بعد وہ بھی مٹ گیا اور اس کی اٹھائی ہوئی نازی تحریک بھی ختم ہو گئی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سماجی انقلاب برپا کیا، اس کے اثرات براہِ راست طور پر مسلم قوموں میں سفر کر رہے ہیں اور بالواسطہ طور پر سارے عالم انسانی میں۔

فرق کا سبب

سوشل جسٹس یا مساوی انصاف (equal justice) کے بارہ میں محققین نے اعتراف کیا ہے کہ یہ مقصد اگر حقیقی طور پر کسی نظام میں حاصل ہوا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بیان سوامی دیویکانند کا ہے جس کو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔ یہاں یہ سوال ہے کہ اس انسانی مقصد کو حاصل

کرنے میں صرف اسلام ہی کیوں کامیاب ہوسکا۔ دوسرے نظام یا مذہب اس مقصد کے حصول میں ناکام کیوں ہوگئے۔ اس کی دو خاص وجہیں ہیں۔ دونوں کو واضح کرنے کے لیے یہاں ہم ہندوازم اورمسیحیت کی مثال دیں گے۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اسلام میں انسانی برابری کے حق میں ایک مکمل آئیڈیالوجی پائی جاتی ہے۔ جب کہ دوسرے کسی نظام میں ایسی آئیڈیالوجی موجود نہیں۔ مثال کے طور پر ہندوازم، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، عین اپنے عقیدہ کی رو سے انسانیت کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس کی عین فلاسفی کا یہ تقاضا ہے کہ انسانوں میں ایک گروہ کو اونچا درجہ ملے، اور دوسرے کو نیچے درجہ کی مخلوق سمجھا جائے۔ اس عقیدہ کی موجودگی میں دونوں گروہوں سے برابر کا معاملہ کیا جانا ممکن نہیں۔ جو لوگ اس اعتقادی نظام سے متاثر ہوں وہ کبھی ان لوگوں کو اپنا مساوی نہیں سمجھ سکتے جن کو وہ بظاہر اپنے سے کمتر دیکھ رہے ہوں۔

یہاں میں یاد دلاؤں گا کہ ۱۹۵۳ میں پریسیڈنٹ آف انڈیا نے بیک ورڈ کلاسز کمیشن (Backward Classes Commission) مقرر کیا تھا۔ اس کے چیرمین کا کا صاحب کالیلکر تھے۔ اس کمیشن نے مفصل جائزہ کے بعد ۱۹۵۵ میں اپنی ۲۶۲ صفحہ کی رپورٹ پیش کی جو گورنمنٹ پریس سے ۱۹۵۶ میں شائع ہوئی۔ یہ مطبوعہ رپورٹ دہلی پبلک لائبریری میں موجود ہے اور میں نے وہیں سے لے کر اس کو پڑھا ہے۔

اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ بھارت میں ذات پات کا جو نظام پایا جاتا ہے وہ بقیہ دنیا سے بالکل الگ نوعیت کا ہے۔ یہ صرف معاشی اسباب سے نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر دوسرے ملکوں میں ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے اسباب زیادہ گہرے ہیں۔ اس کی جڑیں بھارت کے اقتصادی نظام میں پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ صرف انڈیا کی خصوصیت ہے کہ اس نے سماجی نابرابری کو انسانی فطرت میں شامل قرار دیا۔ اس نے مذہبی اور روحانی پس منظر میں اس کو ایک پُراسرار ادارہ کی حیثیت دیدی :

It is the peculiarity of India that it recognised the social differences inherent in human nature and gave them an institutional and mystic form with a religious and spiritual background. (p.14)

کا لیلکر کمیشن نے جو بات کہی وہ عین مطابق واقعہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انڈیا میں اونچ نیچ کو ایک پیدائشی فرق کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ اس عقیدہ کے مطابق یہ ایک حتمی اور ناگزیر فطری حقیقت ہے۔ اور جہاں ایسا عقیدہ پایا جائے وہاں فرق کو مٹانے یا سب کو یکساں انصاف دینے کا ذہن ہی سرے سے پیدا نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلہ میں دوسری رکاوٹ کی مثال مسیحیت کے نظام میں نظر آتی ہے۔ یہاں میں ایک رپورٹ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو ٹائمس آف انڈیا کے سنڈے ریویو (۲۲ دسمبر ۱۹۹۱) میں چھپی ہے۔ یہ رپورٹ پانچ کرسچین جرنلسٹوں کی ایک ٹیم نے تیار کی ہے۔ رپورٹ کے مطابق، انڈیا میں مسیحی فرقہ کی جو تعداد ہے۔ اس میں ۵۰ فی صد سے زیادہ نچلے طبقہ کے لوگ ہیں جن کو دلت کرسچین (Dalit Christians) کہا جاتا ہے۔ وہ اب تک چرچ کی طرف سے امتیازی سلوک کا شکار ہو رہے ہیں :

Those who came over from the backward Hindu strata still find themselves bogged down in discrimination from the church.

دلت کرسچین کا مُردہ شخص " اپر کاسٹ کرسچین " کے قبرستان میں دفن نہیں ہو سکتا۔ اس کا نکاح اونچے طبقہ کے مسیحیوں میں نہیں ہو سکتا۔ چرچ میں ان کے لیے علحدہ نشست ہوتی ہے۔ تعلیمی اداروں میں ان کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔ چرچ کے اعلیٰ عہدے ان کو نہیں دیے جاتے۔ کیرلا میں مسیحیت دو ہزار سال سے ہے مگر اب تک وہاں یہ تفریق پائی جاتی ہے۔ برابری کا درجہ (equal status) نہ ملنے کی وجہ سے دلت کرسچین میں سخت بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ اب تک چھ ہزار مسیحی اپنے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب میں چلے گئے۔

مدراس کے کیتھولک آرک بشپ (Dr Casmur Guanadickman) سے اس سلسلہ میں سوال کیا گیا۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ چرچ کے نظام میں طاقتور کاسٹ سسٹم (strong caste system) موجود ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں مانتا ہوں کہ یہ الٹی طرف قدم ہے۔ مگر بعض اوقات عقیدہ کی طاقت حقیقت کو توڑنے میں کامیاب نہیں ہوتی :

I agree, it was a retrograde step. But sometimes the power of faith cannot break reality.

مسیحیت کا عقیدہ نابرابری یا سماجی بے انصافی کی تعلیم نہیں دیتا۔ مگر مسیحیت کی کمی یہ ہے کہ اس کے یہاں اس عقیدہ کی پشت پر مساوات کا کوئی طاقت ور تاریخی نمونہ موجود نہیں۔ حضرت مسیح کا مشن دعوت کے مرحلہ ہی میں ختم ہو گیا۔ وہ عملی انقلاب کے مرحلہ تک نہیں پہنچا۔ اس لیے مسیحیت کے دورِ اوّل میں مساوات کا طاقت ور عملی نمونہ بھی قائم نہ ہو سکا۔ ایسی حالت میں صرف عقیدہ عملی تبدیلی لانے کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔

اسلام کا معاملہ مذکورہ دونوں نظاموں کے برعکس یہ ہے کہ اس کے یہاں مساوات اور برابری کے سلوک کے حق میں ایک مکمل آئیڈیالوجی موجود ہے۔ اسی کے ساتھ اسلام میں ایک انتہائی کامل اور معیاری عملی نمونہ موجود ہے۔ اسلام کے دورِ اول کی تاریخ میں ان دونوں چیزوں کی موجودگی نے ہمیشہ کے لیے اسلام کی تاریخ کا رخ متعین کر دیا ہے۔ اب اسلامی تاریخ کو اسی رخ پر سفر کرنا ہے۔ کوئی اور رخ اتنا طاقت ور نہیں ہو سکتا کہ وہ اسلام کی تاریخ کے سفر کو اس کی طرف موڑ دے۔

اسلام کی یہ خصوصیت تمام انسانوں کے لیے رحمت ہے۔ وہ ساری قوموں کے لیے امید کی روشنی ہے۔ اس معاملہ میں اگر تعصب کو دخل نہ دیا جائے اور اسی طرح کھلے ذہن کا ثبوت دیا جائے جو مذہب کے علاوہ تمام سیکولر باتوں کے لیے ہمیشہ اختیار کیا جاتا ہے تو اچانک لوگوں کو معلوم ہو کہ اسلام کی صورت میں یہاں خداوند عالم کی ایک عظیم رحمت خدا کے تمام بندوں کے لیے موجود ہے۔

اسلام کسی گروہ کی قومی روایت نہیں۔ حتیٰ کہ وہ دوسرے مذاہب سے الگ کوئی انوکھا مذہب بھی نہیں۔ وہ پچھلے مذاہب ہی کا محفوظ اور مستند اڈیشن ہے۔ وہ ہر ایک کی فطرت کی آواز ہے۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو اسلام ہر آدمی کو خود اپنا اثاثہ معلوم ہوگا۔ اسلام کو پانا اس کے لیے ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص خود اپنی ایک کھوئی چیز کو ازسرِ نو پا جائے۔

طلاق اسلام میں

یہ فطرت کا تقاضا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت باہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوکر ایک ساتھ زندگی گزاریں۔ اسلامی شریعت میں اس کے لیے نکاح کا طریقہ مقرر کیا گیا ہے۔ اسلام کے مطابق، نکاح ایک معاشرتی عہد (civil contract) ہے جو ایک عورت اور ایک مرد کی باہمی رضامندی (mutual consent) سے وقوع میں آتا ہے۔

نکاح کا یہ عمل ایک اعتبار سے خاندانی زندگی کی تعمیر ہے۔ اور دوسرے اعتبار سے وہ پورے انسانی سماج کی تربیت ہے۔ عورت اور مرد اگر اپنی شادی شدہ زندگی میں اچھی بیوی اور اچھے شوہر ثابت ہوں تو یقینی طور پر وہ وسیع تر سماج کے لیے بھی اچھے شہری ثابت ہوں گے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہے (خیرکم خیرکم لاھلہ) سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح

شادی شدہ زندگی کی یہی خاص اہمیت ہے جس کی بنا پر اسلام میں اس رشتہ کو نہایت مقدس قرار دیا گیا ہے، اور اس کی پائداری اور خوش گواری کے لیے تفصیلی احکام مقرر کیے گئے ہیں۔ تاہم زیادہ قانونی بندش بغاوت کا ذہن پیدا کرتی ہے۔ اس لیے اسلام میں فطری حد تک ضروری قانونی بندش مقرر کرنے کے بعد یہ کوشش کی گئی ہے کہ انسانی ارادہ کی اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ خود اپنے فیصلہ سے اپنے آپ کو صحیح مطلوبہ حد کے اندر قائم رکھے۔

خاندان دراصل تربیتِ انسانی کا ابتدائی یونٹ ہے۔ خاندان کے ادارہ کا ٹوٹنا تربیتِ انسانی کے ادارہ کا ٹوٹنا ہے۔ اگر خاندان کا ادارہ بار بار ٹوٹنے لگے تو اس کا یہ عظیم نقصان ہوگا کہ تربیتِ افراد کا وہ کام ہونے سے رہ جائے گا جس کے اوپر انسانیت کی تعمیر کا انحصار ہے۔

اسلامی شریعت میں اس سلسلہ میں طلاق کے لیے جو قوانین بنائے گئے ہیں وہ بنیادی طور پر طلاق کو روکنے کے لیے ہیں نہ کہ طلاق کو وقوع میں لانے کے لیے۔ شریعت کی ساری کوشش یہ ہے کہ طلاق کے عمل کو روکا جائے۔ عورت اور مرد جب ایک بار رشتۂ

نکاح میں منسلک ہو کر ایک خاندان بنائیں تو وہ آخر وقت تک اس کو قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ اسی لیے رشتۂ نکاح کو قرآن میں میثاق غلیظ (النساء ۲۱) کہا گیا ہے، یعنی پختہ عہد۔

نکاح زندگی کا ایک عمومی قانون ہے اور طلاق صرف ایک استثناء ہے۔ اسی لیے اسلام میں نکاح کو انتہائی پسندیدہ چیز قرار دیا گیا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

النکاحُ مِن سنتی فمَن لم یعمل بِسنتی فلیس مِنی (سنن ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب ماجاء فی فضل النکاح)	نکاح میرا طریقہ ہے۔ پس جو شخص میرے طریقہ پر عمل نہ کرے وہ مجھ سے نہیں۔

طلاق کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے، اسلام میں اگرچہ طلاق کی اجازت ہے۔ مگر اس کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ اس کو صرف انتہائی ناگزیر حالت میں استعمال کیا جائے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طلاق اگرچہ حلال ہے مگر وہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض حلال ہے (ابغضُ الحلالِ إلی اللہِ تعالیٰ الطلاقُ) سنن ابی داؤد، ابواب الطلاق، باب فی کراہیۃ الطلاق

۱۔ جب ایک مرد اور ایک عورت شوہر اور بیوی کی حیثیت سے مل کر ساتھ رہتے ہیں تو، فطرت کے عام قانون کے تحت، دونوں کے درمیان اختلافات بھی ضرور پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایک حیاتیاتی اور نفسیاتی حقیقت ہے کہ اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر مرد اور پیدا ہونے والی ہر عورت ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے اس دنیا میں اتحاد کی ایک ہی ممکن صورت ہے ——— اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنا۔

شکایت کو نظر انداز کرتے ہوئے مل کر رہنے کا یہ مقصد کس طرح حاصل ہوگا، اس کا راز ایک لفظ میں صبر ہے۔ صبر کا مزاج ہی واحد چیز ہے جو دو شخصوں کے درمیان مشترک اور متحد زندگی کو ممکن بناتا ہے۔ جب انسانی فطرت کے تحت شکایت کے اسباب کا پیش آنا لازمی ہو، اور اسی کے ساتھ عورت اور مرد کی مشترک زندگی بھی ایک لازمی انسانی ضرورت ہو تو عملی طور پر اشتراک اور اتحاد کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ دونوں صبر و

اعراض کو زندگی کے ایک مستقل اصول کے طور پر اختیار کریں۔

کسی بھی سماج میں طلاق کے جو واقعات ہوتے ہیں، ان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ۹۰ فی صد طلاق کے واقعات کا سبب "زبان درازی" ہے۔ کسی بات پر عورت یا مرد کو غصہ آگیا یا کوئی بات اس کو ناگوار معلوم ہوئی۔ اس کے بعد اس کی زبان سے سخت الفاظ نکل گئے۔ دوسرا فریق اس کو نظر انداز نہ کر سکا، اس نے بھی جواب میں سخت جملہ کہہ دیا۔ اب تلخ تکرار کی نوبت آگئی۔ اس تلخی کے زیر اثر مرد نے کہہ دیا کہ تم کو طلاق۔ یا عورت نے کہہ دیا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ طلاق یا علٰحدگی کا سبب زیادہ تر اسی قسم کے واقعات ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں مومن مرد اور مومن عورت کی صفات بتاتے ہوئے ایک صفت والصابرین والصابرات (الاحزاب ۳۵) کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ قرآن کی اس آیت کے مطابق، مرد کو بھی صبر کی روش اختیار کرنا ہے اور عورت کو بھی صبر کے طریقہ پر قائم رہنا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی ناخوش گوار باتوں کو برداشت کرنا ہے۔ اگر وہ صبر و برداشت کی روش اختیار نہ کریں تو ان کا باہمی رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ اور باہمی رشتہ ٹوٹنے کے بعد دونوں کو اس سے زیادہ بڑی بات برداشت کرنی پڑے گی جو رشتہ کو باقی رکھنے کی صورت میں انھیں برداشت کرنے کی ضرورت تھی۔

زوجین کو صبر و برداشت کی عام تلقین کے علاوہ اس سلسلہ میں بعض خصوصی ہدایتیں بھی احادیث میں دی گئی ہیں جو نکاح کے بندھن میں پائداری کے لیے ضروری ہیں۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا يفرك مؤمن مؤمنة إن كره منها خلقاً رضي منها آخر۔
(صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیۃ بالنساء)

کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے بغض نہ کرے۔ اگر اس کی کوئی عادت اس کو بری لگے تو اس میں دوسری عادت ہوگی جو اس کو خوش کر دے۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہر آدمی کے اندر کچھ اچھی باتیں ہوتی ہیں اور اسی کے ساتھ کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کو اس کی کمزوری کہا جا سکتا ہے۔ یہی معاملہ شوہر اور بیوی کا بھی ہے۔ ایسی

حالت میں دونوں کے درمیان نباہ کا فطری اصول یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی شخصیت کے اچھے پہلو کو یاد رکھیں، اور دونوں ایک دوسرے کے کمزور پہلو کو نظرانداز کرتے رہیں۔ اگر عورت اور مرد اس معاملہ میں باشعور ہو جائیں اور اس کو ایک اصول کے طور پر اپنی زندگی میں اختیار کرلیں تو یقیناً وہ ان کے لیے پائدار ازدواجی زندگی کی ضمانت بن جائے گا۔

۲۔ تاہم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مذکورہ تدبیر کافی نہیں ہوتی۔ شوہر اور بیوی کے درمیان ایسی شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو بظاہر اس سے زیادہ سخت ہوتی ہیں کہ ان کو نظرانداز کردیا جائے۔ اس قسم کی صورت پیش آنے کے بعد بھی یہ صحیح نہیں ہے کہ جہاں ایسا ہو فوراً طلاق دے کر علاحدگی اختیار کر لی جائے۔ اس کے بجائے تحمل سے کام لیتے ہوئے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ہم کو حسب ذیل آیت میں رہنمائی دی گئی ہے :

واللٰتی تخافون نشوزھن فعظوھن واھجروھن فی المضاجع واضربوھن فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلا (النساء ۳۴)	اور جن عورتوں سے تم کو نافرمانی کا اندیشہ ہو ان کو سمجھاؤ اور ان کو ان کے بستروں میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ پس اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف الزام کی راہ تلاش نہ کرو۔

کسی مرد کو اگر اپنی بیوی سے شکایت پیدا ہو تو اس کے لیے پہلا کام طلاق دینا نہیں ہے، بلکہ عورت کو نصیحت کرنا ہے۔ یعنی نرمی، سنجیدگی اور خیرخواہی کے ساتھ اس کو سمجھایا جائے۔ نفرت کے جواب میں نفرت نہ کی جائے بلکہ نفرت کے جواب میں محبت کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

اگر نصیحت بے اثر ہو جائے تو اس کے بعد شوہر کو اپنی بیوی کے ساتھ ترک کلام یا ترک صحبت کا تجربہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس میں بھی انتقام کا جذبہ ہرگز شامل نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو مکمل طور پر اصلاح اور تربیت کے ذہن کے تحت انجام دینا چاہیے۔

اگر بالفرض کوئی عورت ایسی ہے جس کے لیے نصیحت اور ترک تعلق کی تدبیریں غیر موثر ثابت ہوتی ہیں تو اس کے بعد اجازت ہے کہ مرد اس کو ہلکی سزا دے سکتا ہے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ضرب (مارنے) کی اجازت صرف اختلاف یا شکایت پر ہرگز نہیں ہے۔ یہ نشوز پر ہے۔ نشوز کی تشریح حدیث میں معروف میں نافرمانی سے کی گئی ہے (اضربوهن اذا عصينكم في المعروف) نیز یہ کہ اس ضرب کو بے تکلیف کی مار (ضربا غير مبرح) ہونا چاہیے۔ بے تکلیف کی مار کیا ہے، اس کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ مسواک (ٹوتھ برش) یا اس جیسی کسی چیز سے مارنا (بالسواك ونحوه)

جامع البیان للطبری ۵/۶۷—۶۹

۲۔ زوجین میں اختلاف ظاہر ہو تو کوشش یہ ہونا چاہیے کہ دونوں آپس ہی میں صلح کرلیں۔ کیونکہ صلح کا طریقہ اللہ کے نزدیک ہر حال میں بہتر ہے (والصلح خير، النساء ۱۲۸) اور اگر گھریلو سطح پر معاملہ ختم نہ ہو تب بھی طلاق کی بات نہیں کرنا ہے بلکہ ثالثی کے طریقہ پر اس کو حل کرنے کی کوشش کرنا ہے:

وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها إن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما۔ إن الله كان عليما خبيرا۔

(النساء ۳۵)

اور اگر تم کو دونوں کے درمیان تعلقات بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک ثالث مرد کے رشتہ داروں میں سے کھڑا کرو اور ایک ثالث عورت کے رشتہ داروں میں سے کھڑا کرو۔ اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کر دے گا۔ بے شک اللہ جاننے والا باخبر ہے۔

دو شخصوں کی نزاع کو ثالث (arbiter) کے ذریعہ طے کرنے کا یہ اصول نہایت فطری اصول ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان جب اختلاف پیدا ہو جائے تو دونوں ایک دوسرے کے بارہ میں متاثر ذہن کے تحت سوچنے لگتے ہیں۔ وہ حقائق کی بنیاد پر بے لاگ رائے نہیں قائم کرپاتے۔ ایسی حالت میں جھگڑے کو ختم کرنے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرے فریق کو درمیان میں لایا جائے۔ یہ تیسرا فریق معاملہ سے ذاتی طور پر وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے غیر متاثر ذہن کے تحت سوچے گا اور ایسے منصفانہ فیصلہ تک پہنچ جائے گا جو دونوں کے لیے

قابل قبول ہو۔

جب معاملہ کو ثالث کے سپرد کر دیا جائے تو اس وقت عورت اور مرد کو کس ذہن کے تحت اس کا استقبال کرنا چاہیے، اس کا اندازہ خلافتِ راشدہ کے زمانہ کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔

خلیفۂ چہارم علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک عورت اور مرد کے درمیان ازدواجی جھگڑا ہوا۔ دونوں حضرت علی کے پاس آئے۔ آپ نے مذکورہ قرآنی آیت کے مطابق یہ حکم دیا کہ دونوں کے خاندان سے ایک ایک شخص کو لے کر ثالثی بورڈ بنایا جائے۔ یہ ثالثی بورڈ دونوں کے حالات معلوم کرنے کے بعد جو فیصلہ دے اس کو دونوں بلا جرح مان لیں۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں :

فقالتِ المرأةُ رضيتُ بكتابِ اللهِ لي وعليَّ۔ فقال الرجلُ (ما الفرقةُ فلا۔ فقالَ عليٌّ كذبتَ، واللهِ لاتبرحُ حتّى ترضىٰ بمثلِ ما رضيتْ به

(جامع البیان للطبری، ۵/۷۱)

عورت نے کہا کہ میں راضی ہوں اللہ کی کتاب پر، خواہ فیصلہ میرے موافق ہو یا میرے خلاف۔ مرد نے کہا کہ مگر تفریق کا فیصلہ مجھے منظور نہیں۔ حضرت علی نے فرمایا کہ تم نے جھوٹ کہا۔ خدا کی قسم تم یہاں سے اٹھ نہیں سکتے جب تک تم اس طرح راضی نہ ہو جاؤ جس طرح عورت راضی ہوئی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سچے مومن کے اندر یہ آمادگی ہونا چاہیے کہ وہ قرآنی حکم کے مطابق، ثالث کو مانے اور یہ بھی آمادگی ہونا چاہیے کہ ثالث جو فیصلہ دے اس کو وہ مزید بحث کے بغیر قبول کر لے۔

۴۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زندگی کا نظام ہمیشہ مقرر انداز پر نہیں چلتا۔ چنانچہ سارے تحفظات کے باوجود ایسا ہوتا ہے کہ کچھ شادی شدہ جوڑے شادی کے بعد علاحدگی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے اندر نکاح کے بعد طلاق کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں شریعت ان کی رہ نمائی اس طرح کرتی ہے کہ ان کے لیے طلاق کا ایک متعین ضابطہ مقرر کرتی

ہے۔ یہ ضابطہ قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے :

الطلاق مرتان فامساك بمعروف او تسریح باحسان (البقرہ ۲۲۹)

طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو قاعدہ کے مطابق رکھ لینا ہے یا خوش اسلوبی کیساتھ رخصت کر دینا۔

اس آیت کی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ جو شخص (دو مہینہ میں) دو بار طلاق دیدے تو وہ تیسری بار طلاق دینے میں اللہ سے ڈرے۔ یا تو وہ اس کے حق میں کوئی بھی ظلم کیے بغیر اس کو چھوڑ دے، یا اس کو حسن معاشرت کے ساتھ روک لے (ای من طلق اثنتین فلیتق اللہ فی الثالثة فاما ترکھا غیر مظلومة شیئا من حقھا واما مسکھا محسنا عشرتھا) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۳/۱۲۶

اس آیت اور دوسری آیات واحادیث کی روشنی میں علماء شریعت نے طلاق کا تفصیلی قانون مرتب کیا ہے، اس سلسلہ میں فقہی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے بنیادی شرعی پوزیشن یہ ہے کہ اپنے مراحل کے اعتبار سے طلاق کی تین صورتیں ہیں ——— طلاق رجعی، طلاق بائن، طلاق مغلظہ۔

جب ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے تو شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ وہ ایسا نہ کرے کہ اچانک اس کو مطلقہ قرار دے کر اسے اپنے سے جدا کر دے۔ بلکہ اس کو یہ کرنا چاہیے کہ پہلے مہینہ میں حیض سے پاک ہونے کے بعد وہ اپنی عورت سے کہے کہ میں نے تم کو ایک طلاق دیا۔ اس کے بعد دونوں ایک مہینہ تک سوچتے رہیں۔ اس درمیان میں اگر رائے بدل گئی تو مرد اپنے قول طلاق کو واپس لے کر دوبارہ اپنی بیوی سے تعلقات قائم کر سکتا ہے۔

ایسا نہ کرنے کی صورت میں اگلے مہینہ میں دوبارہ طہر کی حالت میں وہ اپنی بیوی سے کہے گا کہ میں نے تم کو دوسری بار طلاق دیا۔ اس اثناء میں دوبارہ مرد کے لیے یہ موقع ہے کہ اگر اس کی رائے بدل جائے تو وہ طلاق کو واپس لے کر اپنی بیوی سے دوبارہ تعلقات قائم کر سکتا ہے۔ اصطلاح میں ان دونوں کو طلاق رجعی کہا جاتا ہے، کیوں کہ مرد کو ان سے مراجعت کا حق حاصل ہے۔

ابتدائی دو مہینوں میں مرد اگر اپنے قول سے رجوع نہ کرے اور تیسرا حیض آکر تیسرا مہینہ شروع ہو جائے تو اب عملی طور پر طلاق واقع ہو جائے گی۔ اس کو طلاق بائن کہا جاتا ہے۔

طلاق بائن پڑ جانے کے بعد مراجعت کے لیے تنہا مرد کا قول کافی نہیں۔ اب صرف عورت اور مرد کی باہمی رضامندی سے نکاح ثانی ہو سکتا ہے۔ اگر دونوں نے نکاح ثانی کر لیا تو دوبارہ وہ شوہر اور بیوی کی طرح ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ آدمی تیسرے مہینہ میں یا اس کے بعد یہ کہہ دے کہ میں نے تم کو تیسری بار طلاق دیا۔ ایسا کہنے کے بعد آخری طلاق واقع ہو جائے گی۔ اس کو طلاق مغلظ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کے لیے حرام ہو جائیں گے۔ البتہ اگر حلالہ کی صورت پیدا ہو جائے تو دوبارہ ان کے درمیان نکاح ہو سکتا ہے۔

شوہر اگر دوسری بار طلاق دینے کے بعد اپنی بیوی سے مراجعت کا ارادہ نہ رکھتا ہو تب بھی اسے چاہیے کہ عورت کو اس کے حقوق دے کر خوش اسلوبی کے ساتھ اسے رخصت کر دے۔ جہاں تک تیسری بار طلاق کا تعلق ہے تو شریعت نے اس کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ کیونکہ دو بار طلاق دے کر علحدہ ہو جانے کے بعد بھی یہ امکان باقی رہتا ہے کہ شوہر تجدید نکاح کے ذریعہ پھر اپنی سابقہ بیوی سے تعلق قائم کر لے۔ مگر تیسری بار طلاق دینے کے بعد مذکورہ استثنائی صورت (حلالہ) کے علاوہ اس مرد اور اس عورت کے درمیان نکاح مستقل طور پر حرام ہو جاتا ہے۔

مذکورہ مقرر طریقہ نے طلاق کو ایک جذباتی اقدام کے بجائے ایک سوچا سمجھا منصوبہ بند عمل بنا دیا۔ اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ طلاق اکثر حالات میں غصہ کا نتیجہ ہوتا ہے تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ طریقہ طلاق کے خلاف ایک زبردست روک (check) ہے۔ کیونکہ غصہ کوئی مستقل باقی رہنے والی چیز نہیں۔ ایک مدت گزرنے کے بعد لازماً وہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ تقریباً یقینی ہے کہ جو لوگ غصہ کی بنا پر اپنی بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کریں گے، وقت گزرنے کے بعد وہ خود ہی اپنے کیے پر پچھتائیں گے۔ اور رجوع کر لیں گے۔ کیوں کہ طلاق کوئی سادہ بات نہیں۔ اکثر حالات میں وہ گھر کو اجاڑنے اور بچوں کے مستقبل کو تباہ کرنے کے ہم معنی ہے۔ غصہ ٹھنڈا ہوتے ہی آدمی کو طلاق کا برا انجام دکھائی دے گا اور وہ رجوع کر کے اس سے باز رہے گا۔

آدمی جب ایک عورت سے نکاح کرتا ہے تو اس کے لیے صرف ایک بار یہ کہنا کافی ہوتا ہے کہ میں نے تم کو اپنی زوجیت میں قبول کیا۔ مگر طلاق کے لیے شریعت میں یہ حکم دیا گیا کہ تین مہینہ کے دوران مرحلہ وار طریقہ پر بتدریج اس کو مکمل کرو۔

گویا نکاح کے لیے تو ایک قول کافی ہے مگر طلاق کے عمل کی تکمیل کے لیے کئی قول کی ضرورت ہے۔ مزید یہ کہ نکاح کے برعکس، طلاق کے ایک قول اور دوسرے قول کے درمیان شریعت نے لمبا وقفہ (gap) دینا پسند کیا ہے۔ اس وقفہ کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ اس دوران شوہر اپنے فیصلہ پر اچھی طرح غور کر لے۔ وہ اپنے قریبی لوگوں سے اس کے بارہ میں بخوبی مشورہ کرے۔ حتی کہ اس کے متعلقین کو یہ موقع بھی مل جائے کہ جب انھیں طلاق کے معاملہ کی خبر ملے تو اس میں دخل دے کر وہ طرفین کو سمجھائیں اور طلاق کو روکنے کی کوشش کریں۔ یہ مقصد وقفہ کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے طلاق کو ایک باوقفہ عمل بنا دیا گیا۔

ان ساری پیش بندیوں کا واضح مطلب یہ ہے کہ جذباتی ابال کو ٹھنڈا کیا جائے اور اس طرح طلاق کے معاملہ کو اس کے آخری انجام تک پہنچنے سے روکا جائے۔ کیوں کہ طلاق کسی بھی شخص کے لیے مسئلہ سے نجات کے ہم معنی نہیں ہے۔ طلاق اپنے انجام کے اعتبار سے صرف یہ ہے کہ آدمی ایک مسئلہ سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنے آپ کو دوسرے شدید تر مسئلہ میں مبتلا کر لے۔

۵۔ ان ساری پیش بندیوں کے باوجود کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان بعض اوقات جہالت یا شدید غصہ کی وجہ سے معتدل انداز میں سوچ نہیں پاتا۔ وہ جوش میں آکر ایک ہی مجلس میں اپنی بیوی سے کہہ دیتا ہے کہ تم کو تین طلاق یا طلاق، طلاق، طلاق۔ ایسے واقعات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آئے۔ اور اب بھی پیش آتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص ایسا کرے اس کے بارہ میں کیا فیصلہ کیا جائے۔ یعنی تین طلاق کو ایک طلاق قرار دے کر مذکورہ باوقفہ عمل جاری کرنے کی تلقین کی جائے۔ یا تین طلاق کو تین طلاق قرار دے کر میاں بیوی کے درمیان علٰحدگی کرا دی جائے۔ اس سلسلہ کی ایک رہنما حدیث یہاں درج کی جاتی ہے جس کو امام ابوداؤد اور دوسرے کئی محدثین نے نقل کیا ہے :

عن عبد الله بن عباس قال، طلق ركانة بن عبد يزيد امرأته ثلاثا في مجلس واحد- فحزن عليها حزنا شديدا- فسأله النبي صلى الله عليه وسلم- كيف طلقتها- قال ثلاثا في مجلس واحد- فقال النبي صلى الله عليه وسلم- إنما تلك واحدة فارتجعها إن شئت (فتح الباری ۹/ ۲۷۵)

رکانہ ابن عبد یزید نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاق دے دی۔ پھر وہ اس پر بہت غم گین ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم نے کس طرح طلاق دی۔ انھوں نے کہا کہ ایک مجلس میں تین بار۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ سب ایک ہی ہے۔ اگر تم چاہو تو اپنی بیوی سے مراجعت کرلو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو کر ایک ہی مجلس میں تینوں طلاق دینے کا اعلان کر دیتا ہے تو اگرچہ یہ شریعت کے مقرر طریقہ سے انحراف ہے اور اس اعتبار سے وہ آدمی گنہ گار ہے، تاہم انسانی کمزوری کی رعایت کرتے ہوئے اس کے اس فعل کو ایک لغو فعل قرار دیا جائے گا۔ اس کو تاکید بیان یا شدت اظہار پر محمول کرتے ہوئے تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیا جائے گا۔ ایسے آدمی سے کہا جائے گا کہ ایک شرعی مسئلہ میں تم نے جو زیادتی کی ہے اس کے لیے اللہ سے توبہ کرو اور تین کو ایک شمار کرتے ہوئے حسب منشا اپنی بیوی کے ساتھ معاملہ کرو۔

۶۔ تاہم اس مسئلہ میں دور اول میں ایک مختلف مثال ملتی ہے۔ یہ مثال خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ہے۔ یہ مثال امام مسلم کی ایک روایت میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

عن ابن عباس، قال كان الطلاقُ على عهدِ رسول الله صلى الله عليه وسلم وابي بكرٍ وسنتينِ من خلافةِ عمرَ طلاقُ الثلاثِ واحدةً- فقال عُمر بن الخطاب انّ الناسَ قد استعجلوا في امرٍ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانہ میں اور عمر کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاق ایک ہی طلاق ہوتی تھی۔ پھر عمر بن خطابؓ نے کہا کہ لوگ اس معاملہ میں جلد بازی کر رہے ہیں جس میں ان کے لیے مہلت تھی۔

فلو کانت لھُم فیہِ اناۃٌ   پس کیوں نہ اس کو ہم ان کے اوپر نافذ کردیں۔
امضیناہُ علیھم فامضاہُ علیھم   چنانچہ انھوں نے ان کے اوپر اسے نافذ
(صحیح مسلم بشرح النووی ۱۰/۷۰)   کر دیا۔

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق کا یہ عمل بظاہر قرآن وسنت کے طریقہ کے خلاف معلوم ہوتا ہے مگر یہ صرف ایک غلط فہمی ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ شریعت کے عموم میں ایک وقتی استثناء کی مثال ہے نہ کہ شریعت کے عموم میں ترمیم کی مثال۔ خلیفۂ دوم کے اس عمل سے شریعت کا مذکورہ مسئلہ نہیں بدلتا۔ اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی میں حالات کی مکمل رعایت رکھی گئی ہے۔ شریعت کا ہر قانون ایک دائمی قانون ہے۔ مگر مسلمانوں کے حاکم کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی فرد کے کیس کی مخصوص نوعیت کی بنا پر اس کے حق میں ایک استثنائی فیصلہ کرے۔ تاہم حاکم کا یہ فیصلہ صرف ایک وقتی حکم ہوگا نہ کہ ابدی قانون۔

اس سلسلہ کی مختلف روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ دوم نے اپنے زمانہ کے جن چند افراد کیساتھ ایسا کیا وہ بطور شرعی مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کی حیثیت ایک قسم کے انتظامی حکم (executive order) کی تھی۔ انھوں نے حاکم کی حیثیت سے بعض متعین افراد کے لیے بطور سزا یہ حکم جاری کیا تھا۔

چنانچہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت عمر فاروقؓ کے پاس ایسا کوئی آدمی لایا جاتا جس نے اپنی عورت کو ایک مجلس میں بیک وقت تین طلاق دی تھی تو اس کو وہ اس کی سرکشی قرار دیتے اور اس کی پیٹھ پر کوڑا مارتے (عن انس، ان عمر کان اذا اُتی برجل طلق امرأتہ ثلاثا اوجع ظھرہ) فتح الباری ۹/۲۷۵

۷۔ یہاں ایک اور پہلو کا اضافہ کرنا ضروری ہے۔ اس اضافہ کے بغیر یہ بات بالکل ادھوری رہے گی۔ وہ یہ کہ حضرت عمر نے جب تین طلاق کو تین طلاق قرار دینے کا مذکورہ استثنائی فیصلہ دیا تو ان کی حیثیت موجودہ زمانہ کے ایک بے اختیار عالم جیسی نہ تھی۔ بلکہ وہ مکمل طور پر ایک بااختیار حاکم کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ مسلّمہ طور پر اس پوزیشن میں تھے کہ جو مرد اس قسم کا غیر قرآنی طریقہ اختیار کرے اس کو وہ سزا دیں، اس کو اور کوئی زیادتی کرنے سے روک سکیں۔

دوسری طرف وہ اِس با اختیار حیثیت میں تھے کہ اِس حکم کے نفاذ کے نتیجہ میں جو عورت نئے مسائل حیات سے دوچار ہوئی ہے، اس کی بھی کامل تلافی کرسکیں۔ مثلاً سماج کے اندر اس کے لیے باعزت زندگی کی ضمانت، طلاق کے بعد اگر وہ معاشی اعتبار سے ضرورت مند ہوگئی ہے تو سرکاری بیت المال سے اس کے لیے مستقل گزارہ جاری کرنا، وغیرہ۔

آج اگر کوئی شخص تین طلاق کو نافذ کرنے کے لیے حضرت عمر فاروق کی نظیر پیش کرے تو اس سے پہلے اس کو خلیفہ جیسی با اختیار حیثیت کا مالک بننا چاہیے، اس کے بعد ہی اس کو یہ حق ہوگا کہ وہ خلیفۂ دوم کے اس مسلک کا حوالہ دے یا اس پر عمل کرے۔ کیوں کہ حضرت عمر کا مذکورہ فیصلہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے حاکم وقت کا ایک فیصلہ تھا نہ کہ سادہ طور پر صرف عالم یا مفتی کا ایک فیصلہ۔

۸۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ خلیفۂ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب اپنا مذکورہ فیصلہ دیا تو بعض روایت کے مطابق صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے اختلاف کیا۔ بقیہ صحابہ جو اس وقت مدینہ میں موجود تھے یا جن کے علم میں یہ بات آئی، انھوں نے اس سے اختلاف کا اظہار نہیں کیا۔ اس سے کچھ علماء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس مسئلہ پر صحابہ کا اجماع ہو چکا ہے۔ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

واستدلوا باجماع الصحابة حين قضى به عمر بن الخطاب رضى الله عنه فاقروه عليه ولم ينكر احد من الصحابة وقوع الثلاث بلفظ واحد على عمر بن الخطاب فدل ذلك على الاجماع	اس سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے۔ کیوں کہ جب حضرت عمر نے یہ فیصلہ دیا تو صحابہ نے اس سے اتفاق کیا اور صحابہ میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا کہ ایک بار میں تین طلاق دینے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس پر اجماع ہے۔
(روائع البيان ۱/۳۲۴)	

یہاں یہ سوال ہے کہ صحابہ نے کس چیز پر اتفاق کیا تھا۔ صحابہ نے اس پر اتفاق نہیں کیا تھا کہ تین طلاق کو تین طلاق قرار دینا اصولاً درست ہے۔ بلکہ ان کا اتفاق اس پر تھا کہ ایسا کرنا انتظاماً درست ہے۔

صحابہ کسی ایسی بات پر اتفاق نہیں کر سکتے تھے جو قرآن کے مقرر طریقہ کو بدلنے کے ہم معنی ہو۔ انھوں نے دراصل اس بات پر اتفاق کیا تھا کہ حاکم کو یہ اختیار ہے کہ بوقت ضرورت وہ استثنائی طور پر کسی فرد خاص کے بارہ میں اس طرح کا ایک فیصلہ دے جو فیصلہ خلیفہ دوم نے اپنے زمانہ میں دیا۔

صحابہ کا یہ اجماع ترمیم شریعت پر نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ اجماع صرف اس بات پر تھا کہ مسلمانوں کے حاکم کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی صواب دید کے مطابق کسی شخص خاص کے لیے ایک ایسے تعزیری حکم کا نفاذ کرے جو شریعت کے عمومی قانون میں ایک وقتی استثنا کی حیثیت رکھتا ہو۔ حاکم وقت کا یہ حق شریعت میں مسلّم ہے، اور نکاح وطلاق کے علاوہ دوسرے امور میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ جیسے قحط کے زمانہ میں چوری پر چور کا ہاتھ نہ کاٹنا۔

۹۔ آخری بات یہ کہ شریعت میں جس طرح مرد کو تفریق کا حق دیا گیا ہے اسی طرح عورت کو بھی تفریق کا حق حاصل ہے۔ البتہ عورت چونکہ پیدائشی طور پر جذباتی (emotional) واقع ہوئی ہے اس لیے دونوں کے طریق کار میں کسی قدر فرق رکھا گیا ہے۔ اس کی صورت مختصر طور پر یہ ہے کہ مرد کو تفریق کا جو اختیار طلاق کی صورت میں حاصل ہے، عورت کو وہی اختیار خلع اور تفویض طلاق کے ذریعہ دیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مرد اگر خلع کے لیے راضی نہ ہو تو عورت اپنے معاملہ کو قاضی کے پاس لے جائے گی اور قاضی پوری روداد سننے کے بعد حسب حالات دونوں کے درمیان تفریق کرا دے گا۔

اس کے علاوہ عورت کے لیے ایک اور صورت ہے جس کو نکاح تفویض کہا جاتا ہے۔ یعنی عورت نکاح کے وقت خود یا اپنے وکیل کے ذریعہ اپنے ہونے والے شوہر سے یہ باضابطہ عہد لے لے کہ شوہر اگر اس کے واجبی حقوق کی ادائیگی میں کوتاہ ثابت ہو تو عورت کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ خود اپنے فیصلہ سے اس کے ساتھ رشتۂ ازدواج کو توڑ دے اور اس سے علاحدہ ہو جائے۔ اس کی مزید تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

خلاصۂ کلام

اوپر کی بحث سے معلوم ہوا کہ طلاق کے لیے شریعت کا مقرر طریقہ یہ ہے کہ طلاق الگ الگ

بتدریج دی جائے، اور وہ لمبے وقفہ کے بعد مکمل ہو۔ یہی طلاق کا صحیح شرعی طریقہ ہے۔ تاہم ہر قانون کا غلط استعمال (misuse) ہوتا ہے، اسی طرح کچھ لوگ طلاق کے قانون کا بھی غلط استعمال کرتے ہیں اور ایک ہی مجلس میں بیک وقت اپنی بیوی کو تین طلاق دیدیتے ہیں۔

قانون کے اس طرح غلط استعمال کی صورت میں طلاق دینے والے کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے، اس میں حسب حالات دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے تین طلاق کو لفظی تاکید پر محمول کرتے ہوئے اسے ایک ہی طلاق مانا جائے۔ اور اس کو رجعت کے حق سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دی جائے۔

تاہم کسی شخص کو اس کے کیس کی مخصوص نوعیت کی بنا پر اس رخصت سے مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کی سرکشی پر حاکم اسے تعزیری سزا دے سکتا ہے۔ یا اس کے تین طلاق کو تین طلاق قرار دے کر اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی بھی کرا سکتا ہے، تاکہ وہ اپنے گھر کی بربادی کی صورت میں اپنی غیر ذمہ دارانہ روش کی سزا بھگتے۔ نیز اس کا یہ فائدہ بھی ہے کہ ایسے افراد کے انحراف کے برے انجام کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کو عبرت ہو اور آئندہ وہ اس قسم کے فعل کو دہرانے سے باز رہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں حضرت عمر فاروق کا انتظامی حکم اس لیے نہیں تھا کہ اس کو عمومی شرعی مسئلہ کی مانند مستقل طور پر رائج کر دیا جائے۔ وہ صرف اس لیے تھا کہ معاشرہ میں شرعی طریقہ سے انحراف کی حوصلہ شکنی ہو اور مشروع طریقہ پر طلاق دینے کا رواج از سر نو لوگوں کے درمیان قائم ہو جائے۔ خلیفہ دوم کا حکم ایک وقتی استثناء تھا نہ کہ کوئی مستقل شرعی مسئلہ۔ یہ وقتی استثناء بشرطِ ضرورت آئندہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے جس طرح وہ ماضی میں اختیار کیا گیا۔

تاہم اس کا حق صرف با اختیار حاکم کو ہے۔ یہ دراصل ایک انتظامی حکم تھا، اور انتظامی حکم کا حق صرف منتظم کو ہوتا ہے، عام آدمی کو ہرگز اس کا حق حاصل نہیں۔ کیوں کہ عام آدمی ان نتائج سے نپٹنے پر قادر نہیں جو اس قسم کے کسی حکم کے نفاذ کے بعد لازماً پیدا ہوتے ہیں۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اردو	
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمت قرآن	30/-
عظمت اسلام	–
عظمت صحابہ	7/-
دین کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہور اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
رازِ حیات	50/-
صراط مستقیم	40/-
خاتون اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-
حدیث رسول	–
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	50/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
اقوال حکمت	20/-
ڈائری جلد اول	–
ڈائری جلد دوم	–
سفرنامہ (ملکی اسفار)	–

انوار حکمت	–
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	7/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحاد ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	7/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	7/-
حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-
نار جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
شخصیات اسلام	–
تعدد ازدواج	3/-

روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	7/-
علم کلام	7/-
صداقت اسلام	–
علماء اور دور جدید	8/-
ہندستانی مسلمان	7/-
سیرت رسول	–
ہندستان آزادی کے بعد	3/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	7/-
اسلام کا تعارف	4/-
ہندی	
سچائی کی تلاش	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	6/-
پیغمبر اسلام	3/-
عربی	3/-
الاسلام یتحدی	85/-
الاسلام والعصر الحديث	–
منزل کی اور	
آڈیو کیسٹ	
A-1 حقیقت ایمان	25/-
A-2 حقیقت نماز	25/-
A-3 حقیقت روزہ	25/-
A-4 حقیقت زکوٰۃ	25/-
A-5 حقیقت حج	25/-
A-6 سنت رسول	25/-
A-7 میدان عمل	25/-
A-8 پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
A-9 اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
A-10 اسلامی اخلاق	25/-
A-11 اتحاد ملت	25/-
A-12 تعمیر ملت	25/-
A-13 نصیحت لقمان	25/-

A-14 متفرق سورتیں ۱	30/-
A-15 متفرق سورتیں ۲	30/-
A-16 متفرق سورتیں ۳	30/-
ویڈیو کیسٹ	
V-1 پیغمبر انقلاب	200/-
V-2 اسلام داعی امن	200/-
V-3 اسلام دور جدید کا خالق	–
V-4 امت مسلمہ اور جدید چیلنج	–
V-5 اسلام اور سماجی انصاف	–
V-6 اسلام اور دور حاضر	–
God Arises	Rs 85/-
Muhammad The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It is	40/-
God Oriented Life	60/-
Words of the Prophet	–
Indian Muslims (Hb)	145/-
Indian Muslims (Pb)	55/-
Introducing Islam	–
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
Islam the Voice of Human Nature	-
Islam the Creator of Modern Age	-
The Way of Find God	6/-
The Teachings of Islam	7/-
The Good Life	7/-
The Garden of Paradise	7/-
The Fire of Hell	7/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad The Ideal Character	6/-
Polygamy and Islam	3/-
Words of Wisdom	–
فائل الرسالہ اردو (مجلد)	
سال 1982	100/-
1985	100/-
1986	100/-
1987	100/-
1988	100/-
1989	100/-
1990	100/-
1991	100/-
فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)	
1984 تا 1991	100/- فی جلد
فائل الرسالہ ہندی (مجلد)	
1990-91	100/-

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, NIZAMUDDIN WEST MARKET, NEW DELHI 110 013 Tel 4697333.

RNI 28822/76 □ U(SE)-12/93
Delhi Postal Regd No. DL/11154/93